SHIVAJI UNIVERSITY, KOLHAPUR

شیواجی یونیورسٹی ، کولھا پور

B.A. PART - III

بی۔ اے ۔ سال سوم

SEMESTER - V

PAPER NO. X

URDU KI ADABI TAHERIKEN

اردو کی ادبی تحریکیں

Dr. Ateeq Ahmed Qureshi

Head Of Department, Urdu

Arts, Science & Commerce College, Badnapur. Distt. Jalana

مصنف :۔ ڈاکٹر عتیق احمد قریشی

(صدرشعبہء اردو)

آرٹس، سائنس اینڈ کامرس کالج، بدناپور۔ ضلع: جالنہ

SHIVAJI UNIVERSITY, KOLHAPUR

شیواجی یونیورسٹی ، کولھا پور

B.A. PART - III

بی۔ اے ۔ سال سوم

SEMESTER - V

PAPER NO. X

URDU KI ADABI TAHERIKEN

اردو کی ادبی تحریکیں

Dr. Ateeq Ahmed Qureshi

Head Of Department, Urdu

Arts, Science & Commerce College, Badnapur. Distt. Jalana

مصنف :۔ ڈاکٹر عتیق احمد قریشی

(صدر شعبہء اردو)

آرٹس، سائنس اینڈ کامرس کالج، بدنا پور۔ ضلع: جالنہ

پیش لفظ

بی اے سال اول اور سال دوم کی نصابی کتب کے مطالعہ کے بعد طلباء اردو ادب کی اصنافِ سخن سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں اور اب اس قابل ہو گئے ہیں کہ وہ اردو ادب کی تحریکات اور اس سے وابستہ شعراء کے فن اور شخصیت کے بارے میں واقفیت حاصل کریں۔ اسی مقصد کے تحت اس کتاب میں اردو زبان و ادب کی مختلف اہم تحریکات کے بارے میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ جس میں بالخصوص علی گڑھ تحریک، ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور ان دونوں تحریکات سے وابستہ شعراء و ادباء کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

یہ کتاب مذکورہ بالا موضوعات پر مشتمل ہے جو بی اے ڈگری سال سوم کے نصاب میں شامل ہیں جو عام طور پر اردو ادب کی اہم تحریکات کے بنیادی پہلوؤں پر بحث کرتی ہے۔ نصاب کو سہولت کی خاطر ابواب اور ذیلی اکائیوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ماہرین نے اکائیوں کی تیاری ایک خاص ڈھنگ سے کی ہے۔ جس کا خاکہ اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ طلباء زیادہ دشواری کے بغیر نہ صرف ان اکائیوں کو پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہو جائیں بلکہ اس بات سے بھی آگہی حاصل کر لیں کہ کس موضوع پر تحقیق کیوں کر اور کیسے کی جائے۔ اس کے لئے ہر باب کے اختتام پر اپنی ترقی کی جانچ کرنے کے لئے ''اکائی کے اہم سوالات'' کے زیر عنوان سوالات دیئے گئے ہیں۔ ان سوالات کے جوابات لکھنے کے لئے جگہ دی گئی ہے۔ طلباء کو چاہئے کہ دی گئی جگہ میں اپنے جوابات لکھیں۔

توقع کی جاتی ہے کہ زیر نظر پیش کردہ نصابی مواد، موضوع کے تعلق سے معلومات حاصل کرنے میں طلباء کے لئے زیادہ کارآمد اور مفید ثابت ہوگا۔

نصاب کے مقاصد

یہ کتاب فاصلاتی طلباء کے لئے اسپیشل مضمون 'اردو' کے سلسلہ کا ایک جزو ہے جو بی اے سال سوم کے پرچہ دہم سے تعلق رکھتی ہے۔اس کتاب میں (۴) چار ابواب ہیں اور ان کے تحت (۳۲) ضمنی اکائیاں شامل ہیں۔

اس کتاب میں درج ابواب میں بالترتیب پہلا باب جو درج کیا گیا ہے وہ باب نمبر ا ہے۔ یہ باب ''علی گڑھ تحریک'' پر مشتمل ہے۔اس میں کل (سات) اکائیاں شامل ہیں جن کے تحت اکبر الہ آبادی کی شخصیت اور ان کی مزاحیہ شاعری کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد باب نمبر ۲ ہے جو ترقی پسند تحریک اور اس سے وابستہ نثر نگار' پر مشتمل ہے۔اس میں کل (۹) نو اکائیاں شامل ہیں۔جن کے تحت موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کے بعد باب نمبر ۳ ہے اور اس میں بھی (سات) اکائیاں شامل ہیں جن کے تحت ترقی پسند تحریک اور اس سے وابستہ شعراء' پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کے بعد کتاب ہذا کا آخری باب یعنی باب ۴ درج کیا گیا ہے اور اس میں جملہ (۹) اکائیاں شامل ہیں جن کے تحت جدیدیت کے بارے میں مفصل بیان کیا گیا ہے۔

ہر باب کے خلاصے کے بعد فرہنگ دی گئی ہے جس کے تحت مشکل الفاظ و اصطلاحات کے معنی و مطلب کو درج کیا گیا ہے۔

طلبہ کی سہولت کے لئے ہر اکائی کے آخر میں اہم سوالات دیئے گئے ہیں تا کہ طلبہ ان اسے استفادہ حاصل کریں اور مطالعہ کردہ معلومات کی خود ہی جانچ کر سکیں۔

اسی طرح ہر باب کے اختتام پر طلبہ کو مزید مطالعہ اور استفادہ کیلئے سفارش کردہ کتابوں کے نام درج کر دیئے گئے ہیں۔

توقع کی جاتی ہے کہ زیرِ نظر پیش کردہ نصابی مواد، موضوع کے تعلق سے معلومات حاصل کرنے میں طلباء کے لئے زیادہ کارآمد اور مفید ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر عتیق احمد قریشی

بی۔ اے۔ سال سوم (سمیسٹر پنجم)

URDU KI ADABI TAHERIKEN

فہرست
برائے نصاب

اردو کی ادبی تحریکیں

Page No.	CHAPTER	ابواب	نمبر شمار
7	Alighar Taherik	علی گڑھ تحریک	1
15	Sir Sayyed Ahmad Khan Ke Naamwar Rufqa	سرسیّد احمد خاں کے نامور رفقاء	2
23	Taraqqi Pasand Adabi Taherik	ترقی پسند ادبی تحریک	3
34	Romani Taherik	رومانوی تحریک	4.A
46	Ood Panch Mein Tanz O Miza	اودھ پنچ میں طنز و مزاح	4.B

باب نمبر : ۱
علی گڑھ تحریک

اکائی کے اجزاء

1.1 مقاصد

1.2 تمہید

1.3 علی گڑھ تحریک کا پس منظر

1.4 اعلی گڑھ تحریک کا آغاز وارتقاا

1.5 علی گڑھ تحریک کے اردو ادب پر اثرات

1.6 خلاصہ

1.7 فرہنگ

1.8 مزید مطالعہ کے لے کتب

1.1 مقاصد

اس باب کے ذریعے طلباء درج ذیل نکات سے آگاہ ہوں گے۔

- ☆ علی گڑھ تحریک کے پس منظر سے واقف ہوں گے۔
- ☆ علی گڑھ تحریک کا آغاز وارتقا سے واقف ہوں گے۔
- ☆ سرسیّد احمد خاں کی تعلیمی وادبی خدمات سے سے واقف ہوں گے۔
- ☆ علی گڑھ تحریک کے اہم مصنفین سے واقف ہوں گے۔
- ☆ علی گڑھ تحریک کے اُردو ادب پر اثرات سے واقف ہوں گے۔

1.2 تمہید

علی گڑھ تحریک کو سرسیّد تحریک کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ سرسیّد احمد خاں کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور تعلیمی سطح پر کی گئی کاوشوں کا ثمر یہ تحریک ثابت ہوئی۔ جس نے اردو ادب کو نئی جہت نئی صورت اور نیا وسیلہ عطا کیا۔ اردو کی ادبی تحریکوں میں علی گڑھ تحریک سب سے اہم ہمہ گیر اور دوررس اثرات کی حامل تحریک تھی۔ اگرچہ یہ خالص ادبی تحریک نہیں تھی مگر سرسیّد کی سیاسی، مذہبی، سماجی، تہذیبی اور تعلیمی کوششوں کے نتیجے میں اردو شعر و ادب کو بھی ایک نئی جہت ملی اور اس نئی جہت کی تبلیغ، ترسیل اور تشہیر مختلیف ادبی اور تہذیبی وسائل کے ذریعہ تیزی سے کی گئی۔

1.3 علی گڑھ تحریک کا پس منظر:

کوئی بھی تحریک یکا یک وجود میں نہیں آتی اس کے پیچھے ایک پورا پس منظر ہوتا ہے۔ علی گڑھ تحریک کو اس کے پس منظر سے علیحدہ کر کے نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ مختصراً اس پس منظر کو سمجھ لیا جائے جس نے سرسیّد کے مضطرب اور بے چین دل اور حساس ذہن کو ایک خاص انداز سے سوچنے پر مجبور کیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کا جو حال ہوا اس کے بعد وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ اب مسلمانوں کا قدیم تہذیب کا خستہ لبادہ اوڑھے رہنے اور اپنی عظمت گزشتہ کے ترانے گاتے رہنے سے کام نہیں چلے گا بلکہ نئی علمی، سماجی اور سیاسی حالات کا مقابلہ کرنے ہی سے ان کو زندگی کی حرارت مل سکے گی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے اور عام ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کی زبردست تباہی اور بدحالی نے ان کی رہی سہی شعاعِ امیّد کو بھی مایوسی کے اندھیروں میں لپیٹ دیا اور انھوں نے اندازہ کر لیا کہ اب طاقت اور تلوار کے زور سے اس قوم کو حیات اور توانائی نہیں مل سکتی بلکہ مغربی علوم و فنون سے واقفیت اور تعلیم جدید ہی سے وہ زندگی حاصل ہو سکتی ہے جس کی اس قوم کو شدید ضرورت ہے۔

1.4 علی گڑھ تحریک کا آغاز و ارتقاء :

سرسیّد نے ایک ہمہ گیر اصلاحی تحریک کے ذریعہ ادب کی معاشرتی اور تہذیبی اہمیت کو سامنے رکھ کر اردو میں مقصدی شعر و ادب کی تخلیق کی روایت قائم کی۔ "انجمن پنجاب" کی نظم نگاری کی تحریک کو سرسیّد کے افادی نکتہ نظر نے اور واضح کیا۔ دوسرے لفظوں میں سرسیّد شعر و ادب کو عام زندگی کا ترجمان اور معاشرتی اصلاحی کا ذریعہ جو بنانا چاہتے تھے

اسے حالؔی، شبلؔی، نذیر احمد اور اسماعیل میرٹھی اور دوسرے شاعروں نے جوش وخروش کے ساتھ اپنی نظموں سے ثابت کیا اور اسی طرح افادی قومی نظموں نے اردو شاعری کے رُخ ہی کو بدل کے رکھ دیا۔ شعروادب اور معاشرے سے اس کے تعلق کی جو بات کی گئی ہے اس کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ سرسیّد کا ادب کے بارے میں جو یہ تصور تھا کہ ''جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔'' اس نے شاعر اور قاری کا ایک تعلق پیدا کر دیا تھا۔

علی گڑھ تحریک سے متاثر شعراء میں حالؔی پیش پیش تھے۔ حالؔی لاہور سے جدید نظم کی روایت لے کر دہلی پہنچے تھے اور بلآخر سرسیّد کی تحریک کے ایک موثر اور فعال رُکن کی حثیت سے ان خیالات کو پیش کرنے لگے۔ ''مقدمہ شعروشاعری'' علی گڑھ تحریک ہی کے بنیادی اصولوں کی تشریح وتفسیر ہے۔ حالؔی نے علی گڑھ کالج اور علی گڑھ تحریک کے علاوہ خود سرسیّد کے مدح میں معمار قوم 'محسن قوم' سرسیّد کی مخالفت کی وجہ 'سرسیّد حیدر آباد میں' ایک پیکر انسانیت اور یادگار سرسیّد جیسی نظمیں لکھیں۔ حالؔی نے معاشی اور معاشرتی اصلاح کے سلسلے میں بھی نظمیں لکھیں۔ 'مدرستہ العلوم علی گڑھ اور مسلمانوں کی تعلیم، علی گڑھ کالج کیا سکھاتا ہے، تنگِ خدمت، فلسفہء ترقی وغیرہ نظمیں بھی اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ان ساری نظموں میں علی گڑھ تحریک کی روحِ جمالی جلوہ گر نظر آتی ہے۔

حالؔی کے علاوہ دوسرے اہم شاعر شبلؔی ہیں۔ شبلؔی اگر چہ سرسیّد کی بڑھی ہوئی عقلیت کے قائل نہیں تھے مگر مجموعی طور پر وہ رعلی گڑھ تحریک کے ہمنواء تھے۔ ان کی قومی اور سیاسی شاعری پر اس تحریک کے اثرات نمایاں ہیں۔ وہ علی گڑھ کالج سے بھی متعلق تھے۔ اس لئے سرسیّد کے دائرہ اثر سے نکل نہ سکے۔ اپنی مثنوی 'صبحِ اُمید' میں شبلؔی نے علی گڑھ تحریک کی ترجمانی بھر پور طریقے سے کی۔ شبلؔی نے ایک اور ترکیب بند روم ومصر وشام کے سفر سے واپسی پر ۱۸۹۲ء میں لکھا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں پڑھی گئی۔ ان کی نظمیں بڑی پُر جوش ہیں۔

تیسری اہم شخصیت نذیر احمد کی تھی۔ نذیر احمد اگر چہ اس معیار کے شاعر نہیں تھے جس معیار کے حالؔی اور شبلؔی تھے۔ مگر سرسیّد کی تحریک اصلاح نے ان کو شاعر بنا دیا تھا چونکہ ان سے کانفرنس کیجلسوں میں نظم کی فرمائش کی جاتی تھی اس لئے وہ نظمیں بھی سنانے لگے۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے متعدد جلسوں میں انھوں نے کئی نظمیں پڑھیں۔

بچایا ڈوبنے سے کشتی دین محمد کو الٰہی نوح کی سی عمر دے سرسیّد احمد کو

انھوں نے سرسیّد کے حق میں قوم کا مسیحا، سیّد احمد خاں کا احسانات اور مرثیہ سیّد احمد خاں جیسی نظمیں کہیں۔

انھوں نے شبلی کی 'صبحِ اُمید' سے متاثر ہوکر 'مرثیہ مبتلا' لکھی جوان کے ناول ''محسنات'' کے آخر میں شامل ہے۔ان کی ایک نظم 'اتمام حجت' یہ نظم ان کے پیغام اور تحریکی مزاج کی ترجمان ہے۔

1.5 علی گڑھ تحریک کے اردو ادب پر اثرات

علی گڑھ تحریک کے براہِ راست حلقہ بگوشوں میں وحیدالدین سلیم، خوشی محمد ناظر، محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی گوہر، مولانا حسرت موہانی، فانی بدایونی، اقبال سہیل، اور بہت سے غیر معروف شعراء شامل ہیں۔جنھوں نے علی گڑھ تحریک کے نظریات اور عقائد کو اپنی نظموں میں پیش کیا۔ کچھ وہ بھی تھے جو اپنے طور سے انھیں خیالات کو پیش کرتے رہے۔اگرچہ براہ راست اس سے متعلق نہیں تھے۔ان میں مولانا محمد حسین آزاد، اسماعیل میرٹھی، اور عبدالحلیم شرر ممتاز ہیں۔اس کے علاوہ شوق قدوائی، نظم طباطبائی اور صفی لکھنوی بھی ممتاز متاثر شعراء ہیں۔

اکبرالہ آبادی اگرچہ سرسیّد کی جدیدیت اور انگریز نوازی کے قائل نہیں تھے۔سرسیّد کی انھوں نے مخالفت بھی کی۔مگر یہ علی گڑھ تحریک کی افادیت اور خلوص کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے ''سرسیّد اور کالج'' نظم لکھی جس میں مدرستہ العلوم علی گڑھ کی حمایت کی اور ''سرسیّد مرحوم اور ہم'' والے قطعہ میں سرسیّد کی شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سیّد کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

علی گڑھ تحریک کے شباب کے زمانے میں ڈاکٹر اقبال نہ تھے مگر ان پر بھی سرسیّد کے افکار کا گہرا اثر تھا جوان کی نظم ''سیّد کی لوحِ تربت'' طلباء علی گڑھ کالج کے نام مسعود مرحم جیسی رثائی نظموں میں جھلکتا ہے۔سرسیّد نے سب سے زیادہ مضامین لکھے۔ سرسیّد کے مضامین مذہبی، اصلاحی اور سیاسی زیادہ تھے۔ان کے موضوعات میں تعلیم، مذہب اور سائنس، انگریز دوستی، مغربی تہذیب کی اچھائیاں عقل کی اہمیت اور مسلمانوں کے عام حالات شامل تھے۔تعلیم تربیت۔غیر مفید تعلیم طریقہ تعلیم مسلمانان۔مسلمان اور تعلیم انگریزی، ہندوستانیوں کی تعلیم، ولایت، عیسائیوں اور مسلمانوں میں باہمی مودت، کفار سے موالات، مہذب قوموں کی پیروی۔انگریزوں کے ساتھ کھانا، پینا عزّت، مذہب ومعاشرت، رسوم وعادات، رسم ورواج کی پابندیوں کے نقصانات وغیرہ کے عنوان سے مقالات اور انشائیے لکھے۔سر

سیّد کے دوسرے ساتھیوں میں محسن الملک نے تعلیم وتربیت کی شبیہ، تدبیر وامید، عزّت اور تفسیر بالرائے کے عنوان سے مضامین لکھے جن میں سے تعلیم وتربیت کی شبیہ ایک خوبصورت تمثیلی اور ادبی مضمون ہے۔ وقارالملک نے توکل، شیرین زبانی، تقوی، اعتدال عام محنت، انسان کی زندگی اور تہذیب وشائستگی کے موضوعات پر مضامین لکھے۔ حالؔی نے کیا مسلمان ترقی کر سکتے ہیں، دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے، ہم جیتے ہیں یا مر گئے، حسب ونسب، مسلمان میں عملی قوت کیوں نہیں رہی۔ تجارت کا اثر عقل واخلاق پر اور زبانِ گویا کے نام سے لکھے۔ ان میں ''زبانِ گویا'' نہایت موثر اور خوبصورت ادب پارہ ہے۔ شبلؔی نے ندوہ اور نصابِ تعلیم، تعلیم قدیم وجدید، ندوت العلماء کیا کر رہا ہے۔ اور ندوہ کی نئی زندگی کا آغاز جیسے علمی مقالے لکھے۔ ان ممتاز اہلِ قلم کے علاوہ عبدالحلیم شرؔر، وحیدالدین سلیم، اور مولوی عزیز مرزا وغیرہ نے بھی بہت سے مضامین لکھے۔

ان مضمون نگاروں کے ساتھ مولوی عبدالحق، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، سیّد سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، بھی تہذیب الاخلاق ہی کے پروردہ مضمون نگار ہیں۔ ''تہذیب الاخلاق'' ہی نے محفوظ علی بدایونی، طفیل احمد منگلوری، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا احسن مارہروی، سجاد انصاری، سجاد حیدر یلدرم، مولوی عنایت اللہ، عظمت اللہ خاں، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، رشید احمد صدیقی، قاضی عبد الغفار، ڈاکٹر عابد حسین، حکیم احمد شجاع، قاضی تلمذ حسین، الیاس برنی، باری علیگ، ڈاکٹر ذاکر حسین، اور پروفیسر محمد مجیب جیسے اہلِ علم اور اہلِ قلم کی پرورش کی۔ جنھوں نے اپنے مضامین، اپنی تصانیف اپنی تالیفات اور اپنے ترجموں سے تحقیق، مزاج نگاری، صحافت، ڈرامہ نگاری، رپورتاژ، افسانہ نگاری، آزاد نظم نگاری، ترکی، فرانسسی، روسی اور انگریزی شاہکاروں اور یورپ کی علمی فتوحات سے اُردو دنیا کو واقف کرایا۔

سرسیّد کو تاریخ سے خاص دلچسپی تھی۔ انہوں نے گبن کی کتاب ''زوالِ سلطنت روما'' کا ترجمہ کروایا۔ خود ''آثارالصنادید'' جیسی کتاب لکھی۔ آئین اکبری کی تصحیح کی۔ تزک جہانگیر کو ایڈٹ کیا۔ خطباتِ احمدیہ اور تبلین الکلام کے تاریخی حصوں میں اپنی مورخانہ صلاحتیں ظاہر کیں۔ ماضی کی شخصیات پر کتابیں اور مضامین لکھوائے۔ شبلؔی نے المامون انہی کے اشارے پر لکھی۔ اس کے علاوہ شبلؔی نے سیرت النبی کے مقدمے میں جو اس بات پر زور دیا ہے کہ ''تاریخ میں کوئی بات محسوسات، اصول مسلمہ اور عقل اور مشاہدے کے خلاف نہ ہو۔''

علی گڑھ تحریک نے جس اصلاحی جذبے قومی شعور اور روشن خیالی کا صور پھونکا تھا۔ اس کے اثرات حالؔی کے مجالس النساء شادؔ عظیم آبادی کے صورت الخیال بیخود دہلوی کے ننگ وناموس اور کشن پرشاد کول کے سادھو اور بیسوا میں نظر آتے

ہیں۔صغری ہمایوں مرزا کے ناول زہرہ فاطمہ، بیگم کے صبر کا پھل، کرنی کا پھل، لالچ کا شکار، محمدی بیگم کے سگھڑ بیٹی اور شریف بیٹی طیبہ بیگم کے ناول انوری اور ظفر جہاں بیگم کے اختر بیگم میں بھی یہی اثرات ملتے ہیں اور یہ اثر پریم چند کے ناولوں میں بھی اجاگر ہے جن میں معاشرتی اصلاح سیاسی امن اور مذہبی عقائد کے درستی کا جذبہ کارفرما ہے۔اصل یہ ہے کہ علی گڑھ تحریک نے مغرب پرستی یا مغربی علوم سے اخذ واستفادے کی جو راہ دکھائی تھی اس نے قریب قریب پورے اردو ادب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔رومانوی ادیبوں کی مغرب پرستی اور اس کے زیر اثر افسانہ نگاری اور انشاء پردازی علی گڑھ تحریک کے اثرات کا نتیجہ ہے جس سے ترقی پسند تحریک نے بھی فائدہ اٹھایا۔موضوعاتی ڈرامہ بھی دراصل اسی تحریک کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔عبدالحلیم شرر کے ڈرامے، شہید وفا اور میوہ تلخ، فائق لکھنوی کا دیش بندھو اور عبدالماجد دریابادی اور ڈاکٹر عابد حسین کا زود پشیماں اور پردہ غفلت اسی طرح کے ڈرامے ہیں۔اس طرح اس کے اثرات ہمہ گیر ہی نہیں بہت دوررس ثابت ہوئے۔

1.6 خلاصہ

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کا جو حال ہوا اس کے بعد وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ اب مسلمانوں کا قدیم تہذیب کا خستہ لبادہ اوڑھے رہنے اور اپنی عظمت گزشتہ کے ترانے گاتے رہنے سے کام نہیں چلے گا بلکہ نئی علمی، سماجی اور سیاسی حالات کا مقابلہ کرنے ہی سے ان کو زندگی کی حرارت مل سکے گی سر سیّد نے ایک ہمہ گیر اصلاحی تحریک کے ذریعہ ادب کی معاشرتی اور تہذیبی اہمیت کو سامنے رکھ کر اردو میں مقصدی شعر وادب کی تخلیق کی روایت قائم کی۔ "انجمن پنجاب" کی نظم نگاری کی تحریک کو سر سیّد کے افادی نکتہ نظر نے اور واضح کیا۔دوسرے لفظوں میں سر سیّد شعر وادب کو عام زندگی کا ترجمان اور معاشرتی اصلاحی کا ذریعہ جو بنانا چاہتے تھے اسے حالؔی، شبلؔی، نذیر احمد اور اسماعیل میرٹھی اور دوسرے شاعروں نے جوش و خروش کے ساتھ اپنی نظموں سے ثابت کیا اور اسی طرح افادی قومی نظموں نے اردو شاعری کے رُخ ہی کو بدل کے رکھ دیا۔حالؔی نے علی گڑھ کالج اور علی گڑھ تحریک کے علاوہ خود سر سیّد کے مدح میں معمار قوم 'محسن قوم' سر سیّد کی مخالفت کی وجہ 'سر سیّد حیدر آباد میں'' ایک پیکر انسانیت اور یادگار سر سیّد جیسی نظمیں لکھیں۔

شبلؔی نے علی گڑھ تحریک کی ترجمانی بھر پور طریقے سے کی۔شبلؔی نے ایک اور ترکیب بند روم ومصر وشام کے سفر سے واپسی پر ۱۸۹۲ء میں لکھا۔محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں پڑھی گئی۔ان کی نظمیں بڑی پُر جوش ہیں۔علی گڑھ تحریک کے براہِ راست حلقہ بگوشوں میں وحیدالدین سلیم، خوشی محمد ناظر، محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی گوہر

،مولانا حسرت موہانی، فانی بدایونی، اقبال سہیل، اور بہت سے غیر معروف شعراء شامل ہیں۔ اکبر الہ آبادی اگر چہ سرسیّد کی جدیدیت اور انگریز نوازی کے قائل نہیں تھے۔ سرسیّد کی انھوں نے مخالفت بھی کی۔ مگر یہ علی گڑھ تحریک کی افادیت اور خلوص کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے ا''سرسیّد اور کالج''، نظم لکھی۔ علی گڑھ تحریک کے شباب کے زمانے میں ڈاکٹر اقبالؔ نہ تھے مگر ان پر بھی سرسیّد کے افکار کا گہرا اثر تھا جوان کی نظم ''سیّد کی لوحِ تربت'' طلباء علی گڑھ کالج کے نام مسعود مرحوم جیسی رثائی نظموں میں جھلکتا ہے۔ سرسیّد نے سب سے زیادہ مضامین لکھے۔ محسن الملک نے تعلیم و تربیت کی شبیہ، تدبیر و امید، عزّت اور تفسیر بالرائے کے عنوان سے مضامین لکھے جن میں سے تعلیم و تربیت کی شبیہ ایک خوبصورت تمثیلی اور ادبی مضمون ہے۔ مولوی عبدالحق، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، سیّد سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، بھی تہذیب الاخلاق ہی کے پروردہ مضمون نگار ہیں۔ ''تہذیب الاخلاق'' ہی نے محفوظ علی بدایونی، طفیل احمد منگلوری، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا احسن مارہروی، سجاد انصاری، سجاد حیدر یلدرم، مولوی عنایت اللہ، عظمت اللہ خاں، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، رشید احمد صدیقی، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر عابد حسین ،حکیم احمد شجاع، قاضی تلمذ حسین، الیاس برنی، باری علیگ، ڈاکٹر ذاکر حسین، اور پروفیسر محمد مجیب جیسے اہلِ علم اور اہلِ قلم کی پرورش کی۔

سرسیّد نے گبن کی کتاب ''زوالِ سلطنت روما'' کا ترجمہ کروایا۔ خود ''آثار الصنادید'' جیسی کتاب لکھی۔ آئین اکبری کی تصحیح کی۔ تزک جہانگیر کو ایڈٹ کیا۔ خطباتِ احمدیہ اور تبلین الکلام کے تاریخی حصوں میں اپنی مورخانہ صلاحتیں ظاہر کیں۔ ماضی کی شخصیات پر کتابیں اور مضامین لکھوائے۔ شبلی نے المامون انہی کے اشارے پر لکھی۔ باالفاظِ دیگر اردو ادب میں سرسیّد احمد خاں کی ادبی خدمات اور علیگڑھ تحریک کا نمایاں کردار رہا۔ جس سے اردو زبان و ادب کی ترقی میں تیزی اور پختگی آئی۔

1.7 مشقی سوالات

۱۔ علی گڑھ تحریک کا پس منظر اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۲۔ علی گڑھ تحریک میں سرسیّد احمد خاں کی خدمات پر روشنی ڈالئے۔

۳۔ سرسیّد احمد خاں کی مضمون نگاری پر سیر حاصل تبصرہ کیجیے۔

۴۔ علی گڑھ تحریک میں دیگر شعراء و مصنفین کی خدمات پر مختصراً نوٹ لکھئے۔

۵۔ علی گڑھ تحریک کا اردو زبان و ادب پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔ بحث کیجیے۔

1.8 فرہنگ

الفاظ	معنی
نوعیت	قسم
تابع	ماتحت
ملحد	کافر
خستہ لبادہ	پرانا لباس
نکبت	مفلسی
تغیر	تبدیلی
تمثیل	کسی مادی چیز کو شکل دینا
غماز	اشارہ کرنے والے، چغلی کرنے والا

1.9 مزید مطالعہ کے لئے کتب

۱۔ علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ — مظہر حسین

۲۔ اُردو ادب کی تحریکیں — انور سدید

۳۔ سرسیّد اور ان کے نامور رفقاء — سیّد عبداللہ

باب نمبر۔ ۲

سرسیّداحمد خاں کے نامور رفقاء

اکائی کے اجزاء

2.1 مقاصد
2.2 تمہید
2.3 سرسیّداحمد خاں کے رفقاء کا مطالعہ
2.3.1 ڈپٹی نذیر احمد
2.3.2 مولانا الطاف حسین حالؔی
2.3.3 مولانا شبلؔی نعمانی
2.3.4 محمد حسین آزاد
2.4 خلاصہ
2.5 نمونہ امتحانی سوالات
2.6 فرہنگ
2.7 حوالہ جاتی کتب

2.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلباء سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ۔۔۔

☆ طلباء سرسیّداحمد خاں کے کارناموں سے واقف ہوں گے۔
☆ طلباء ڈپٹی نذیر احمد کی ادبی خدمات سے واقف ہوں گے۔
☆ طلباء الطاف حسین حالؔی کی زندگی اور انکے ادبی کارناموں سے واقف ہوں گے۔
☆ طلباء محمد حسین آزاد کی ادبی کارکردگی سے واقف ہوں گے۔

2.2 تمہید

اُردو زبان و ادب کو مختلف تحریکوں نے ترقی کے منازل طے کرنے میں مدد کی۔ ترقی پسند تحریک، رومانوی تحریک، حلقہ ارباب ذوق، علی گڑھ تحریک نے اُردو زبان و ادب کو قیمتی سرمایے سے نوازہ۔ وہی ان تحریکوں میں مختلف شعراء و ادیبوں کا تعاون قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام کی یک جہتی و اجتماعیت کی بناء پر ہی ایک عظیم ادبی سرمایہ وجود میں آیا۔ جس میں سرسیّداحمد خاں جیسی سیاسی، سماجی، مذہبی، تعلیمی شخصیت نے علی گڑھ تحریک کو کامیاب بنایا۔ وہی ان کے رفقاء نے بھی ان کے خیالات سے متاثر ہوکر ان کا خوب ساتھ نبھایا۔ جس کی وجہ سے یہ تحریک انفرادیت سے نکل کر اجتماعیت کی ایک عظیم مثال بن گئی۔ سرسیّداحمد خاں کے ان تمام رفقاء میں مولانا الطاف حسین حالؔی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا ڈپٹی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاؔد وغیرہ شعراء و مصنفین نے قابلِ ذکر کارنامے انجام دئے۔ جس کا تفصیلی مطالعہ ہم اس باب میں کریں گے۔

2.3 سرسیّداحمد خاں کے رفقاء کا مطالعہ

2.3.1 ڈپٹی نذیر احمد :

ڈپٹی نذیر احمد کا وطن بجنور ہے۔ بچپن میں دہلی آ گئے۔ اور قدیم دہلی کالج سے تعلیم حاصل کی۔ انگریزی حکومت کی ملازمت کی۔ اس لئے ان کی حمایت کرتے رہے۔ انھوں نے بھی کچھ وقت حیدرآباد میں گذارا۔ بقیہ زندگی دہلی میں رہ کر تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔ ''شمس العلماء'' کے خطاب سے نوازے گئے۔ سرسیّد سے ان کے روابط تھے۔ عموماً تقاریر کے لئے سرسیّد انھیں اپنے ساتھ رکھتے تھے کیوں کہ آواز بلند اور بھاری بھرکم تھی۔ بڑے بڑے اجتماعات میں تقریر کرتے تو سنّاٹا چھا جاتا۔ ان کی تقریروں کے مجموعے، خطابات نذیر احمد نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ جسے پڑھ کر ان کے وسیع علم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ قرآن پاک کی تفسیر بھی انھوں نے لکھی۔ قانون کی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے جن میں ''تعزیراتِ ہند'' اور ''قانونِ شہادت'' مشہور ہیں۔ نذیر احمد کی اصل شہرت ان کی ناولوں سے ہے۔

ظاہر ہے کہ ان کے ناول فکری اور فنّی اعتبار سے کمزور ہیں البتہ ناول کے عناصر ترکیبی ہونے کی بناء پر ان کی تصانیف کو ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے کُل سات ناول لکھے۔ پہلا ناول ''مراۃ العروس'' ۱۸۶۹ء میں

لکھا جو کہ اپنی لڑکی کہ تعلیم و تربیت اور ذہن سازی کے لئے لکھا تھا لیکن ایک انگریز کلکٹر کی فرمائش پر شائع کیا جو مقبول ہوگیا۔ دوسرا ناول ''بنات النعش'' بھی اسی مقصد سے لکھا۔ تیسرا ناول ''توبتہ النصوح'' سب سے زیادہ مشہور اور دلچسپ ہے۔ اس کو پڑھ کر دلّی کے اجڑتے ہوئے مسلم خاندانوں کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس ناول کا زندہ جاوید کردار ''مرزا ظاہردار بیگ'' ہے۔ ان کے دیگر ناولوں کے نام ''ابن الوقت'' ''فسانہ مبتلا'' ''ایامیٰ'' اور ''رویائے صادقہ'' ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کے متعلق عموماً یہ رائے ظاہر کی جاتی ہے کہ فن کے اعتبار سے ان کے ناول، ناول کے بجائے خطبات نظر آتے ہیں جس میں اصلاح معاشرت کی بات کہی گئی ہے۔ مگر اعتراض کرنے والے اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اس وقت سماجی مسائل مسلمانوں کے درمیان سب سے اہم مسلہ بنا ہوا تھا اور سرسیّد تحریک کے زیر اثر ڈپٹی نذیر احمد بھی ناولوں کے ذریعہ لوگوں کو نئی راہ دِکھانا چاہتے تھے۔ اس لحاظ سے ان میں ترقی یافتہ ناولوں کی تمام خوبیاں تلاش کرنا فضول ہے۔ مگر ۱۹ ویں صدی کے ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت کی بہترین تصویریں ان ناولوں میں ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر ناول کے نہ جانے کتنے ایڈیشن نکل چکے ہیں بلکہ دیگر کئی زبانوں میں اس کے ترجمے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد دلّی کی عام بول چال، محاورے، کنائے کے ساتھ ساتھ سنجیدہ علمی زبان کا استعمال بڑی مہارت سے کرتے ہیں۔

2.3.2 مولانا الطاف حسین حالؔی

مولانا الطاف حسین حالؔی کا وطن پانی پت (ہریانہ) ۱۸۵۴ء میں جس وقت ان کی عمر ۱۷ سال تھی۔ دلی آئے اور ادبی شخصیتوں سے ملنے کا موقع ملا۔ خصوصاً غالبؔ سے بڑے متاثر ہوے اور ان سے گہرا رشتہ وابستہ ہوگیا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں وہ دلّی سے چلے گئے۔ پھر ۱۸۶۳ء میں دہلی واپس ہوگئے۔ اس سفر میں نواب مصطفہ خاں شیفتہؔ سے ملاقات ہوئی۔ بغاوت کے بعد وہ دہلی زیادہ دنوں نہ رہ سکے۔ اور لاہور چلے گئے۔ انھوں نے انجمن کے لئے چار نظمیں ''برکھا رُت'' 'نشاط اُمید' 'مناظرہ رحم و انصاف' 'حب وطن' لکھیں جو بہت پسند کی گئیں۔ چند سال لاہور رہ کر دہلی چلے آئے۔

دہلی آکر وہ اُردو نثر نگاری کی طرف توجہ دی۔ کیوں کہ اب وہ سرسیّد احمد خاں کی صحبت میں آگئے تھے۔ ان کی نثر میں سرسیّد کی چھاپ بھی ہے اور انفرادیت بھی۔ مثلاً سادگی، منطقی، استدلال اور بے تکلف اِظہار وغیرہ سرسیّد کے

اثرات کا نتیجہ ہے۔ جب کے سادگی میں لطافت، منطقیت میں شاعرانہ انداز، تمثیلی پیرایہء، فطری اور بول چال کا لہجہ ،عربی اور فارسی الفاظ سے اعتراض مگر بعض جگہ انگریزی کا بے جا استعمال حالؔی کی نثر نگاری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ حالؔی کی نثر نگاری کو دیکھنا ہے تو ان کے سوانح تصانیف کو پڑھنا چاہیے۔ اُردو میں سوانح نگاری کو سرسیّد تحریک نے جلا بخشی۔ حالؔی نے تین سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ خود سرسیّد کی سوانح حیات ''حیاتِ جاوید'' نام سے لکھی۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سرسیّد کی زندگی کے کسی پہلو پر لکھی جانے والی کوئی تحریر اس کے استفادے سے مستغنی نہیں ہوسکتی۔ اس طرح غالب کی سوانح ''یادگارِ غالبؔ'' کے عنوان سے تحریر کی۔ یہ بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی کے ''حیات۔ جاوید''۔ تیسری کتاب ''حیاتِ سعدیؔ'' ہے۔ جو کہ فارسی مشہور شاعر شیخ سعدی علیہ الرحمہ کی سوانح عمری ہے۔

سرسیّد نے حالؔی سے قوم کو بیدار کرنے کے لئے ایک نظم لکھنے کی خواہش کی۔ چنانچہ ''مدوجزرِ اسلام (اسلام کا عروج وزوال) کے نام سے ایک طویل نظم لکھی۔ یہ نظم بعد میں ''مسدسِ حالؔی'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ نظم میں حالؔی نے سب سے پہلے اسلام کے عروج وزوال پر روشنی ڈالی۔ پھر مسلم قوم کی جہالت اور تعلیم کی کمی پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ایک سچّی اور دل سوز آواز کو لوگوں نے سنا۔ سرسیّد اس نظم کو سن کر سر دھنتے تھے۔ زبان سادہ، سلیس اور دلنشین ہے۔ روانی اس نظم کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ۱۸۷۹ء میں یہ نظم شائع ہوئی۔ ہندوستان میں خواتین کی حالتِ زار کو بھی حالؔی نے سمجھا۔ راشدالخیری کو دنیا مصورِ غم کے نام سے جانی جاتی ہے۔ حالؔی بھی عورتوں کے دکھ درد، بیوگی بیچارگی کو اور اپنی نظمو ں میں ان حالات کو پیش کرنے میں جو تصویر کشی کی ہے۔ وہ مصورِ غم سے کسی طرح کم نہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے ۱۸۷۴ء میں ''مناجاتِ بیوہ'' اور ۱۹۰۶ء میں ''چپ کی داد'' کے نام سے طویل نظمیں لکھیں۔ حالؔی اس معاملہ میں سرسیّد سے بھی آگے بڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ ''تعلیم نسواں'' کے بارے میں ان کا ایک واضح تصور تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد کی طرح انھوں نے بھی خواتین کے لئے ناول ''مجالس النساء'' تحریر کی۔

اردو تنقید کی تاریخ میں الطاف حسین حالؔی کا بڑا مقام ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نا ہوگا کہ اُردو میں بحیثیت فن تنقید کی ابتداء حالؔی کے مقدمہ شعروشاعری سے ہوتی ہے۔ ۱۸۹۳ء میں انھوں نے یہ فکر انگیز مقدمہ اپنے مجموعے کلام کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس کے شائع ہوتے ہی پوری ادبی دُنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ اُردو تنقید کو اس سے نئی راہ ملی۔ اس طرح حالؔی پہلے شخص ہے جس نے شعر کو کسوٹی پر پرکھا اور تنقیدی مسائل سے بحث کیں۔ بحیثیت مجموعی سرسیّد کے اہم رفیق حالؔی سے اُردو ادب کو بے انتہا فائدہ پہ اردو تنقید کی تاریخ میں الطاف حسین حالؔی کا بڑا مقام ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نا ہوگا کہ

اُردو میں بحیثیت فن تنقید کی ابتداء حالؔی کے مقدمہ شعروشاعری سے ہوتی ہے۔۱۸۹۳ء میں انھوں نے یہ فکرانگیز مقدمہ اپنے مجموعے کلام کے ساتھ شائع کیا تھا۔اس کے شائع ہوتے ہی پوری ادبی دُنیا میں تہلکہ مچ گیا۔اُردو تنقید کو اس سے نئی راہ ملی۔اس طرح حالؔی پہلے شخص ہے جس نے شعر کو کسوٹی پر پرکھا اور تنقیدی مسائل سے بحث کیں۔بحیثیت مجموعی سر سیّد کے اہم رفیق حالؔی سے اُردو ادب کو بے انتہا فائدہ پہونچا۔

مولانا شبلؔی نعمانی :

مولانا شبلؔی نعمانی (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء) اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوے۔عربی، فارسی اور فلسفہ وغیرہ کی تعلیم اپنے وقت کے علماء سے حاصل کی۔۱۸۷۲ء میں وہ علی گڑھ کالج میں فارسی کے اُستاد کی حثیت سے آئے۔یہاں سر سیّد کے کتب خانے سے بھر پور استفادہ حاصل کیا۔انہی کی وجہ سے سوانح نگاری کی طرف راغب ہوئے۔حالاں کہ اس وقت تک وہ نظمیں لکھتے تھے۔علیگڑھ میں قیام کے دوران پروفیسر آرنلڈ سے فرانسیسی سیکھی۔آرنلڈ سے اتنا گہرا تعلق تھا کہ ان کے ہمراہ مصر، شام ودیگر اسلامک ممالک کا سفر کیا۔سر سیّد کے آخری دور میں کچھ اختلافات کی بنیاد پر شبلؔی اس تحریک سے علاحدہ ہوگئے۔۱۸۹۷ء میں وہ وہاں سے اپنے اعظم گڑھ آگئے اور ایک اسکول کی بنیاد رکھی۔

سر سیّد کے رفقاء میں مولانا شبلؔی نعمانی بڑی عبقریت کے حامل شخصیت تھی۔علم الکلام اور فلسفہ میں کامل دسترس رکھتے تھے۔سوانح نگاری، تاریخ نویسی، ادب انشاء اور شاعری کے ساتھ اُردو تنقید میں انکا بلند مقام ہیں۔ 'سیرۃ النبیؐ' المامون، الفاروق، الغزالی، سیرۃ النعمان، سوانح مولانا روم، ان کے سوانح عمریاں ہیں۔جب کے شعرالعجم اور 'موازنہ انیسؔ ودبیر' سے ان کی تنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مختصر کلیات بھی شائع ہوا ہے۔جس میں مثنوی، مسدس، قصیدے، اور اخلاقی وسیاسی نظمیں ملتی ہیں۔

مولانا شبلؔی نعمانی کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں قوت اور جوش بیاں کے ساتھ ساتھ اعجاز اور اختصار بھی ہیں۔چونکہ مولانا شبلؔی نعمانی جمالیاتی تنقیدی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے نثر میں شاعرانہ فضاء پیدا کرنے کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ وہ برمحل اشعار کا استعمال کر کے معنی وامطالب کو دلکش انداز میں ادا کر دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہے سکتے ہیں کہ نثر کی سادگی میں فنکاری کی ایک خاص شان پائی جاتی ہیں۔ایک ادب کے

طالب علم کو مولانا شبلی نعمانی کی موازنہ انیسؔ و دبیرؔ اور شعرالعجم کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

سرسیّد کے رفقاء میں مولانا شبلی نعمانی بڑی عبقریت کے حامل شخصیت تھی۔علم الکلام اور فلسفہ میں کامل دسترس رکھتے تھے۔سوانح نگاری، تاریخ نویسی، ادب انشاء اور شاعری کے ساتھ اُردو تنقید میں انکا بلند مقام ہیں۔ 'سیرۃ النبیؐ' المامون، الفاروق، الغزالی، سیرۃ النعمان، سوانح مولانا روم، ان کے سوانح عمریاں ہیں۔جب کے شعرالعجم اور 'موازنہ انیسؔ ودبیر' سے ان کی تنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مختصر کلیات بھی شائع ہوا ہے۔جس میں مثنوی، مسدس، قصیدے، اور اخلاقی وسیاسی نظمیں ملتی ہیں۔

محمد حسین آزادؔ

اُردو کے ایک اور بڑے ادیب ہیں جن کا تعلق براہِ راست نسرسیّد تحریک سے نہ تھا مگر ادبی اور فکری پہلو سے اس تحریک کا ساتھ دیتے نظر آتے ہیں یہ ہے محمد حسین آزادؔ ۔انھوں نے نظم اور نثر دونوں میں خدمات انجام دی۔''انجمنِ پنجاب لاہور'' کے روحِ رواں یہی تھے۔اُردو شاعری کو فطری اور موضوعاتی بنانے میں اس انجمن کا بڑا ہاتھ ہے۔حالؔی بھی اس سے وابستہ تھے۔محمد حسین آزادؔ کی مشہور کتابوں میں ''قصصِ ہند''، ''آبِ حیات''، نیرنگِ خیال' 'دربارِ اکبری' اور 'سخندانِ فارس'' کلام نظم محمد حسین آزادؔ وغیرہ ہیں۔

''آبِ حیات' کو ذیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔اُردو شعراء کا تذکرہ پہلی مرتبہ اس میں سماجی پس منظر ،تاریخی ارتقاء اور ادبی شعور کا لحاظ کرتے ہوئے کیا گیا ہے۔

2.4 خلاصہ :

سرسیّد احمد خاں جیسی سیاسی، سماجی، مذہبی، تعلیمی شخصیت نے علی گڑھ تحریک کو کامیاب بنایا۔وہی ان کے رفقاء نے بھی ان کے خیالات سے متاثر ہوکر ان کا خوب ساتھ نبھایا۔جس کی وجہ سے یہ تحریک انفرادیت سے نکل کر اجتماعیت کی ایک عظیم مثال بن گئی۔سرسیّد احمد خاں کے ان تمام رفقاء میں مولانا الطاف حسین حالؔی، مولانا شبلؔی نعمانی، مولانا ڈپٹی نذیر احمد ، مولانا محمد حسین آزادؔ وغیرہ شعراء و مصنفین نے قابلِ ذکر کارنامے انجام دئے۔محمد حسین آزادؔ نے نظم اور نثر دونوں میں خدمات انجام دی۔''انجمنِ پنجاب لاہور'' کے روحِ رواں یہی تھے۔اُردو شاعری کو فطری

اور موضوعاتی بنانے میں اس انجمن کا بڑا ہاتھ ہے۔ حالؔی بھی اس سے وابستہ تھے۔ محمد حسین آزادؔ کی مشہور کتابوں میں ''قصصِ ہند''، ''آبِ حیات''، ''نیرنگِ خیال'' ''دربارِ اکبری'' اور ''سخندانِ فارس'' کلام نظم محمد حسین آزادؔ وغیرہ ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد نے کُل سات ناول لکھے۔ پہلا ناول ''مراۃ العروس'' ۱۸۶۹ء میں لکھا جو کہ اپنی لڑکی کہ تعلیم و تربیت اور ذہن سازی کے لئے لکھا تھا لیکن ایک انگریز کلکٹر کی فرمائش پر شائع کیا جو مقبول ہو گیا۔ دوسرا ناول ''بنات النعش'' بھی اسی مقصد سے لکھا۔ تیسرا ناول ''توبتہ النصوح'' سب سے زیادہ مشہور اور دلچسپ ہے۔ ان کی نثر میں سرسیّد کی چھاپ بھی ہے اور انفرادیت بھی۔ مثلاً سادگی، منطقی، استدلال اور بے تکلف اِظہار وغیرہ سرسیّد کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ جب کے سادگی میں لطافت، منطقیت میں شاعرانہ انداز، تمثیلی پیرایہء، فطری اور بول چال کا لہجہ، عربی اور فارسی الفاظ سے اعتراض مگر بعض جگہ انگریزی کا بے جا استعمال حالؔی کی نثر نگاری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔۔ سر سیّد نے حالؔی سے قوم کو بیدار کرنے کے لئے ایک نظم لکھنے کی خواہش کی۔ چنانچہ ''مدوجزرِ اسلام (اسلام کا عروج وزوال) کے نام سے ایک طویل نظم لکھی۔ یہ نظم بعد میں ''مسدسِ حالؔی'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ نظم میں حالؔی نے سب سے پہلے اسلام کے عروج وزوال پر روشنی ڈالی۔

2.5 نمونہ امتحانی سوالات :

۱۔ شبلؔی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے ء۔
۲۔ الطاف حسین حالؔی کے ادبی مقام کی نشاندہی کیجیے۔
۳۔ ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری پر سیر حاصل تبصرہ کیجیے۔
۴۔ سرسیّد احمد خاں کے ادبی رفقاء کی خدمات مختصراً بیان کیجیے۔

2.6 فرہنگ :

استطاعت	حیثیت۔طاقت
خصلت	فطرت۔عادت
حتی المقدور	جہاں تک ہو سکے۔
پیہم	مسلسل
تلمیحات	اشعار میں کسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کرنا۔
مجوزہ	تجویز کی ہوئی چیز
اختصار	مختصر کرنا

2.7 حوالہ جاتی کتب :

1.	سرسیّد اور ان کے نامور رفقاء	سیّد عبداللہ
2.	میر امّن سے عبدالحق تک	سیّد عبداللہ
3.	مطالعہ سرسیّد احمد خاں	عبدالحق
4.	سرسیّد اور ہندوستانی مسلمان	نورالحسن نقوی
5.	سرسیّد احمد خاں اور انکا عہد	ثریا حسین

اکائی نمبر۔۳
ترقی پسند ادبی تحریک

اکائی کے اجزاء

3.1 مقاصد
3.2 تمہید
3.3 ترقی پسند تحریک کا پس منظر
3.4 ترقی پسند تحریک کا آغاز وارتقاء
3.5 ترقی پسند اُردو شعراء
3.5.1 جوش ملیح آبادی
3.5.2 فیض احمد فیض
3.5.3 مخدوم محی الدین
3.5.4 کیفی اعظمی
3.6 خلاصہ
3.7 مشقی سوالات
3.8 فرہنگ
3.9 حوالہ جاتی کتب

3.1 مقاصد

☆ طلبہ ترقی پسند تحریک کے پس منظر سے واقف ہوں گے۔
☆ طلبہ ترقی پسند تحریک کے آغاز وارتقاء سے واقف ہوں گے۔
☆ طلبہ کی ترقی پسند شعراء اور انکی ادبی خدمات سے واقف ہوں گے۔

3.2 تمہید

ترقی پسند شاعر وادیب کارل مارکس کے جزیاتی نظریے سے اور اس کے اقتصادی نظام سے متاثر تھے۔ متعدد مارکسی دانشور بالا اخر ادب میں ترقی پسند کو اشتراکیت کی منزل سے مربوط کر دیتے ہیں۔ اس نظریہ نے ادب کے جانبدار انہ تصور پر زور دیا۔ مئی ۱۹۵۶ء میں حیدر آباد میں کل ہند اردو مجلس منعقد ہوئی جس میں ترقی پذیر ادیب اور شاعر بھی اکٹھا ہوئے۔ اور وہاں بھی یہی بحث رہی کہ اس کی ضرورت ہے یا نہیں۔ سجاد ظہیر کا خیال تھا کہ اب اس تنظیم کی ضرورت نہیں رہی۔ چونکہ خود ترقی پسندوں میں انتشار پیدا ہو چکا تھا۔ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ جدیدیت کی بحثیں شروع ہو گئی تھیں۔ ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۶۰ء کی ربع صدی میں ترقی پسند تحریک اردو کی ضعف اصناف میں جو قابل قدر اضافے کیے اور اردو شعراء وادب کو وسعت اور ہمہ گیری بخش کر جو ذخیر وفراہم کیا اس سے انکار کرنا ناانصافی ہوگی۔ ذیل میں اردو ادب میں ترقی پسندی کے قابل قدر حصے اور رول کے بارے میں جائزہ پیش کیا جائے گا۔

3.3 پس منظر

ترقی پذیر تحریک کے باقاعدہ آغاز سے قطع نظر اگر ہم غور کریں تو محسوس ہوگا۔ کہ اس تحریک کا خمیر بہت پہلے سے تیار ہو رہا تھا۔ لندن میں ہندوستان کے کافی طلبہ تعلیم کی غرض سے مقیم تھے۔ ان طلبہ کا گر چہ ہندوستان کے مختلف خطوں سے تعلق تھا اور ان کی مادری زبانیں بھی مختلف تھیں لیکن نظریاتی طور پر ان میں ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ ہندوستان میں غریبوں اور مجبوروں پر ہونے والے مظالم کی خبریں ان تک پہنچی رہتی تھیں اور ان میں برطانوی حکومت اور سرمایہ دار طبقہ کے خلاف غم وغصہ بڑھتا جاتا تھا۔ لہذا ہندوستانی نوجوانوں نے جن میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جیوتی گھوش، محمد دین تاثیر اور پرمود سین گپتا وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ''انڈین پروگریسیو رائٹر اسوسیشن'' قائم کی۔ پھر اس کا اعلان نامہ تیار کیا گیا۔

جس میں کہا گیا کہ'' ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے نئے ادب کو ہماری موجود زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہیے اور وہ ہے ہماری روٹی کا' بدحالی کا' ہماری سماجی پستی کا اور سیاسی غلامی کا سوال''

(یعقوب یاور ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری ص۔ 55-56)

اس کے علاوہ اسی اسوسی ایشن نے ایسی تجاویز بھی پیش کیں۔ جن کی بنیاد پر ادیبوں کو اور اس اسوسی ایشن کو آگے

کی کارروائی کرنی تھی۔مثلاً ہندوستان کے مختلف لسانی صوبوں میں ادیبوں کی انجمنیں قائم کرنا۔ان انجمنوں کے درمیان اجتماعوں اور مفلسوں وغیرہ کے ذریعے ربط وتعاون پیدا کرنا۔صوبوں کی مرکز اور لندن کی انجمنوں کے درمیان تعلق پیدا کرنا ترقی پسند کے تخلیق اور ترجمہ کرنا جو صحتمند اور توانا ہو' جس سے ہم تہذیبی پسماندگی کو مٹا سکیں اور ہندوستانی اور سماجی ترقی کی طرف بڑھ سکیں وغیرہ۔اس گروپ نے اپنی پہلی باقاعدہ میٹنگ لندن کے ایک چینی ریستوران ''نان کنگ ریستوران'' میں کی جس میں ملک راج آنند کو صدر منتخب کیا گیا۔یہ لوگ پیرس مین منعقد world congress of the writers for the defance culture سے بھی کافی متاثر ہوئے۔ اس کانفرنس میں میکسم گورکی 'ویلڈ وفرینک' آندرے مارلو برتول بریخت ای ایم فاسٹر' لوئی آراگان' بورس پاسترنج اور رومین رواں جیسے ممتاز ادیبوں نے شرکت کی تھی۔اور انھوں نے جو تجاویز منظور کی تھیں ان میں انسانیت کی بالادستی اور مظالم کی سرکوبی کے عزائم کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔پوری دنیا کے ادیبوں کو متحد کرنے کی یہ ایک بہت بڑی اور کامیاب کوشش تھی۔ان سے کانگرس سے انڈین پروگریسیو ورائٹرس اسوسی ایشن کے ارکان کو اپنے مقاصد کو تیزی سے عملی جامہ پہنانے کی ترغیب ملی۔اور انھوں نے اپنی کوشش لندن کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی شروع کردی اس ضمن میں سب سے پہلے تو انھوں نے اہم ارکان نے دستخطوں کے ساتھ'' اعلان نامہ'' کو ہندوستان کے اہم ادیبوں تک پہنچایا پریم چند میں اس کی زبردست حمایت کرتے ہوئے اسے اپنے رسالے ''ہنس'' میں شائع کردیا۔مجموعی طور پر پورے ملک میں اس اعلان نامہ کا خیر مقدم کیا گیا۔۱۹۳۵ء کے آخر میں سجاد ظہیر ہندوستان واپس آگئے۔انھوں نے مختلف علاقوں اور مختلف زبانوں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں سے رابطہ قائم کیا اس سے پہلے ''انگارے'' کے افسانوں نے ماحول کو کافی گرم کردیا تھا۔جس کے مصنفین میں سجاد ظہیر احمد علی محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں شامل تھے۔ان میں سے موخرالذکر تین ادیبوں نے ہندوستان میں ترقی پسند نظریات کی تبلیغ سجاد ظہیر کی آمد سے پہلے ہی شروع کردی تھی۔اندرون ہندوستان اور لندن میں کی گئی تمام جدوجہد کا نقطۂ عروج اپریل ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں منعقدہ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرس کی صورت میں سامنے آیا۔

3.4 ترقی پسند تحریک آغاز وارتقاء

ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز اپریل ۱۹۳۶ء کی اس کانفرس سے ہوتا ہے جس کی صدارت پریم چند نے کی تھی۔پریم چند نے اپنے صدارتی خطبے میں ادب کی غرض وغایت بیان کی ادیبوں کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور اس جلسے کو ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ قرار دیا۔اس خطبے میں انھوں نے کہا کہ

''ہم اپنے آپ کو ہندوستانی تہذیب کی بہترین روایات کا وارث سمجھتے ہیں۔ اور روایات کو اپناتے ہوئے ہم اپنے ملک میں ہر طرح کی رجعت پسندی کے خلاف جدوجہد کریں گے۔ اور ہر ایسے جذبے کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہترین زندگی کی راہ دکھائے۔''

انھوں نے ادیبوں اور فنکاروں کے لیے حسن و جمال کی بدلتی ہوئی معنویت بدلتے ہوئے حالات اور عصری حیثیت کے تناظر میں ادب کی تعریف بھی پیش کی ہے۔ اس کانفرنس میں شرکت کرنے والوں میں پریم چند کے علاوہ چودھری محمد علی، ردولوی سید سجاد ظہیر احمد علی، فراغ گورکھپوری، محمد الظفر، حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی اور بنگال، مہاراشٹر، گجرات، اور مدراس وغیرہ کے نمائندے شامل تھے۔ اسی کانفرنس میں سجاد ظہیر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکریڑی منتخب کئے گئے۔

لکھنؤ کانفرنس کے خاطر خواہ کامیابی کے بعد مختلف شہروں میں انجمن کی کانفرنسیس منعقد ہوئیں اور اس کی شاخوں کا قیام عمل میں آیا۔ دہلی، ممبئی، کلکتہ، بھیمڑی، حیدر آباد، الہٰ آباد، لکھنؤ، جے پور، رانچی وغیرہ میں بتدریج کانفرنسیس اور سیمینار ہوتے رہیں۔ بے شمار شاعر و ادیب اس تحریک سے وابستہ ہوئے، (جس پر تفصیلی گفتگو آگے کی جائے گی۔) اور اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے بے لوث خدمات انجام دیں۔ جس کے سبب اس تحریک نے تنظیمی و علمی سطح پر ارتقائی منازل طے کیں اور بیسویں صدی کی سب سے کامیاب تحریک بن گئی۔ لیکن جس طرح دن کے بعد رات اور شام کے بعد صبح ہونا فطری عمل ہے اسی طرح عروج کے بعد زوال بھی لازمی ہے۔ اس تحریک کا آغاز ہوا، عروج ہوا۔ اس نے نسلوں کو متاثر کیا۔ ادب کی فضاء پر آسمان کی طرح سایہ فگن ہوگئی اور پھر رفتہ رفتہ تحلیل ہوگئی۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد جو تحریکیں، جو ادارے تعطل اور انتشار کے شکار ہوئے ان میں ترقی پسند تحریک بھی کافی اہم ہے۔ اس تحریک کے روح رواں سید سجاد ظہیر ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ بعض ادیب و شاعر نہیں رہے اور اسی طرح چھٹے دہے میں ہی نظریاتی اعتبار سے اس تحریک میں بکھراؤ کے آثار نظر آنے لگے۔ ۱۹۴۸ء کے بعد رندوے کی قیادت میں کمیونسٹ پارٹی جس دارو گیر کا شکار ہوئی اس کی وجہ سے بہت سے ادیب انجمن ترقی پسند مصنفین سے الگ ہوگے۔ آزادی کے بعد خود ترقی پسند مصنفین نے ایک قرارداد کے ذریعے غیر کمیونسٹ ادیبوں پر انجمن کے دروازے بند کردے۔ انجمن اور تحریک کو نقصان پہنچانے میں اس واقعہ نے سب سے اہم رول ادا کیا اس تحریک کو پروپگنڈہ اور نعرے کا نام بھی دیا گیا۔ بعض ادیب و شاعروں نے جب یہ محسوس کیا کہ یہ تحریک پروپگنڈہ بن گئی ہے اور اس سے ادب

مجروح ہورہا ہے تو انہوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کرلیا، اس طرح آٹھویں دہائی کے آتے آتے ترقی پسند تحریک تحلیل (یہاں تحلیل کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ تحلیل ہونے والے مادے کا وجود گرچہ بظاہر ختم ہوجاتا ہے لیکن اسکی کوئی نہ کوئی صورت اور اس کی اثر انگیزی باقی رہتی ہے) ہوچکی تھی۔اور جدیدیت پوری طرح سے سر ابھار چکی تھی۔

3.5 ترقی پسند اُردو شعراء

3.5.1 جوش ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھے۔حسن پرستی، خود پرستی، عنایت اور سیما بیت جیسی جاگیردارانہ نظام کی خصوصیات انھیں ورثے ملی تھیں۔جوش کو شاعر انقلاب کہا جاتا ہے۔جوش کا انقلابی نظمیں لکھنے پر کچھ تو ملکی و عالمی ماحول نے اکسایا تو اقبال کی انقلابی نظموں نے ان کی رہنمائی کی لیکن چونکہ ان کے یہاں فکر وفلسفیانہ بصیرت کی کمی ہے اس لیے ان کے یہاں انقلاب کا کوئی واضح اور صحیح تصور نہیں ملتا اور وہ انقلاب کی روح تک پہنچنے میں ناکام رہتے ہیں۔ان کا تصور انقلاب حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت کا نتیجہ ہے وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے ہر طاقت سے ٹکرانے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔وہ اس کے لئے کشت وخون سے بھی گریز نہیں کرتے لیکن چونکہ ان کے یہاں اقبالؔ جیسی بصیرت نہیں اس لئے وہ کسی نئی تعمیر کا تصور نہیں پیش کرتے اور وہ تبدیلی یا تخریب ہی کو انقلاب سمجھ بیٹھے ہیں، اس طرح جوشؔ کی انقلابی شاعری کو باغیانہ شاعری کا نام دینا مناسب ہوگا۔

جوشؔ کی بعض نظمیں طنزیہ شاعری کی بہترین مثال ہیں۔ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی جو جوشؔ کی شاعری کو توجہ کے لائق نہیں سمجھتے، انھوں نے بھی جوشؔ کی طنزیہ شاعری کو پسند کیا ہے۔یہ نظمیں جوشؔ نے اپنے گردوپیش میں پائے جانے والے عدم توازن ستم ظریفی حالات یا زندگی کی حقیقت کی بے حرمتی کے ردعمل کے طور پر کہی ہیں۔جوشؔ کی شاعری کا ایک پہلو جو ہمیں خاص طور سے متاثر کرتا ہے وہ ان کی منظر نگاری ہے۔جوشؔ فطرت کے پرستار ہیں، انہوں نے فطرت کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا اور انھیں برتا۔ان کی منظر نگاری میں ہمیں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔اس لئے کہ وہ فطرت کے بکھرے ہوئے حسن کو اپنی آنکھوں کے راستے سے اپنی روح میں جذب کرلیتے ہیں پھر وہ اپنی نظموں کے ذریعہ اپنے پڑھنے والوں کو بھی حسن فطرت سے لطف اندوز ہونے میں شریک کرتے ہیں۔

ان نظموں میں برسات کی شفق، ربودگی، جادو کی سرزمین، فتنہ خانقاہ، جھریاں، نا آشنا مہمان، برسات کی

شام، جوانی کی آمد آمد، آوازوں کی سیڑھیاں، فاختہ کی آواز اور البیلی صبح وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

3.5.2 فیض احمد فیضؔ

فیض احمد فیضؔ کا شمار بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ ترقی پسند شعراء میں وہ صفِ اوّل کے شاعر مانے جاتے ہیں۔ وہ نہ صرف بہترین نظم گو شاعر ہیں بلکہ انھوں نے غزل کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے غزل کی روایتی علامتوں کے پردے میں حکمرانوں کے جو ظلم و ستم 'لیلائے وطن سے محبت' آزادِ وطن کی سازشوں اور اپنی بے گناہی کا ذکر نہایت خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ زبان کا گداز، لہجے کی شیرینی اور جذبے کی دھیمی آنچ نے اُن کی شاعری کو دلکشی اور مقبولیت بخشی ہے، مظلوم و محروم لوگوں کے حقوق کی بازیابی اور ظلم و نا انصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔

'نقشِ فریادی' 'دستِ صبا' 'زندان نامہ' 'دستِ تہہ سنگ' 'سرِ وادی سینا' شامِ شہر یاراں ان کے مشہور شعری مجموعے ہیں۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'میزان' صلیبیں میرے دریچے میں (بیوی کے نام لکھے خطوط کا مجموعہ) ان کا ادبی سرمایہ ہیں۔ فیض احمد فیضؔ نے دیگر ادیبوں کی طرح آزادی کی جدوجہد کے لیے قلم کا سہارا لیا۔ اس کے عوض انھیں قید و بند کی مشکلیں بھی اٹھانی پڑیں۔ دستِ صبا اور دستِ تہہ سنگ ان کے دورِ اسیری کی یادگار ہیں۔ انھیں کئی اعزازات اور ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کی انتقال ۱۹۸۴ء میں ہوا۔

''نثار میں تیری گلیوں پر'' یہ نظم انہی میں سے ایک ہے۔ یہ پوری نظم غزلیہ لب و لہجہ میں ہے۔ شاعر نے وطن کو محبوب کے انداز میں پیش کیا ہے۔ غم دوراں کو غم جاناں میں ڈھال لینے کی یہ نظم بہترین مثال ہے۔ اس نظم کے ہر بند سے فیض احمد فیضؔ کی اپنے وطن سے بے پناہ محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ شاعر کا وطن ایک قید خانے میں تبدیل ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ خود شاعر بے اسیر زنداں ہے بے وفاؤں اور غداروں کی حکومت ہے۔ ملک سے محبت رکھنے والے اور وفادار لوگ سر جھکا کر چلنے پر مجبور ہیں۔ وطن کے جیالوں کا مقدر قید و بند کے سوا کچھ اور نہیں۔ اہلِ ہوس وکیل اور منصف ہیں۔ ایسے میں بھلا انصاف کی امید کیسے کی جا سکتی ہے۔

لیکن ان حالات میں بھی شاعر مایوس نہیں۔ حق و باطل کے درمیان کشمکش ہمیشہ جاری رہی ہے۔ ظالم و جابر اپنی روش سے باز آنے والے نہیں۔ دوسری طرف محبانِ وطن راہِ وفا سے ہٹنے کو تیار نہیں، شاعر کو یقین ہے کہ فتح بہر حال وطن کے جاں نثار کی ہی ہوگی۔ وہ کہتا ہے کہ اگر آج حالات ہمارے لئے سازگار نہیں تو گھبرانے کی بات نہیں۔ جلد ہی کامیابی ہمارے قدم چومے گی اور ظالم و جابر طاقتوں کو پسپا ہونا پڑے گا۔

3.5.3 مخدوم محی الدین

مخدوم محی الدین نے عشقیہ اور رومانی اور انقلابی نظمیں لکھیں۔ مخدوم محی الدین کی بیشتر نظموں میں جمالیاتی کیف اور سرشاری کا انداز ملتا ہے۔ ان میں تازگی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک انقلابی مجاہد ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی بیشتر نظموں کو خشکی اور کرختگی سے بچالیا ہے۔ ممتاز حسین نے اپنے ایک مضمون میں کہا ہے کہ تغزل کے عناصر کی وجہ سے مخدوم محی الدین کی نظمیں فن کا خوبصورت نمونہ بن جاتی ہیں۔ جب کہ ان ہی موضوعات پر سردار جعفری کی آواز خطابت کا روپ لیتی ہے۔ ان کی نظمیں طور، سجدہ، انتظار، محبت کی چھاؤں، نامہ حبیب، وہ، نورس اور پیشمانی، خوبصورت رومانی نظمیں ہیں۔ ان کی انقلابی نظموں مثلاً انقلاب، آتش کدہ قمر اور سپاہی اور اسٹالن اور آخری نظم ''چارہ گر'' میں تو غزلیہ عناصر کی موجودگی اسے خوبصورت فن پارہ بنا دیتی ہے۔ بقول عزیز احمد ''خالص شاعرانہ حیثیت سے بھی اسکے کھرے ہونے میں کلام نہیں۔''

مخدوم محی الدین کا مجموعہ کلام ''سرخ سویرا'' اور ''بساطِ رقص'' اس کا ثبوت ہیں۔ علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک میں ایک ایسا افسانہ نگار کی حیثیت سے داخل ہوئے لیکن جلد یہ وہ شاعری کی طرف مائل ہوگئے اور اس میدان میں اپنا مقام بنالیا۔ ان کا پہلا مجموعہء کلام ''پرواز'' تھا۔ جس میں ''سرمایہ دار لڑکیاں'' اور ''دیہاتی لڑکیاں'' جیسی نظمیں تھیں۔ ان کی نظموں کے عمومی موضوعات اخباری خبروں، بیانات اور اداریوں سے متاثر ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں کرختگی اور خطابت کا انداز نمایاں ہے۔ سردار جعفری اقبال سے بھی متاثر ہیں۔

3.5.4 کیفی اعظمی

کیفی اعظمی بھی مشہور ترقی پسند شاعر ہیں۔ ان کے یہاں بھی خطابت جھلکتی ہے۔ لیکن سردار جعفری کے مقابلے میں کم ہے۔ اندیشہ پیشمانی، ٹرنک کال، پامسٹ، حوصلہ اور تبسّم ان کی اچھی نظمیں ہیں۔ ان کے یہاں بھی وقتی موضوعات ملتے ہیں۔ مثلاً گاندھی، جناح کی ملاقات پر، سوویت یونین اور ہندوستان، فتح برلن اور سوئے برلن جارہی ہے سرخ فوج، قومی حکمراں، ریاست ٹراونکور کے مجاہدوں کا ترانہ اور الیکشن کے دونوں میں مولانا آزاد اور خضرت حیات کی ملاقات وغیرہ کیفی نے شبلی اور اقبال کے تتبع کی بھی کوشش کی۔

اس طرح کی نظموں میں ''مژدہ'' اور ''سپردگی'' شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کوریا کی نعرہ اور ''امین'' وغیرہ نظمیں

بھی ہیں۔جس سے وہ ترقی پسند شاعروں میں ممتاز رہے ہیں۔''جھنکار''اور''آخرشب''ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

3.6 خلاصہ

ترقی پذیر تحریک کے باقاعدہ آغاز سے قطع نظر اگر ہم غور کریں تو محسوس ہوگا۔کہ اس تحریک کا خمیر بہت پہلے سے تیار ہورہا تھا۔لندن میں ہندوستان کے کافی طلبہ تعلیم کی غرض سے مقیم تھے۔ان طلبہ کا گرچہ ہندوستان کے مختلف خطوں سے تعلق تھا اور ان کی مادری زبانیں بھی مختلف تھیں لیکن نظریاتی طور پر ان میں ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔گورکی' ویلڈو فرینک' آندرے مارلو برتول بریخت ای ایم فاسٹر' لوئی آراگان' بورس پاسترنج اور رومین رواں جیسے ممتاز ادیبوں نے شرکت کی تھی۔۱۹۳۵ء کے آخر میں سجاد ظہیر ہندوستان واپس آگئے۔انھوں نے مختلف علاقوں اور مختلف زبانوں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں سے رابطہ قائم کیا اس سے پہلے''انگارے''کے افسانوں نے ماحول کو کافی گرم کردیا تھا۔جس کے مصنفین میں سجاد ظہیر احمد علی محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں شامل تھے۔

ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز اپریل ۱۹۳۶ء کی اس کانفرس سے ہوتا ہے جس کی صدارت پریم چند نے کی تھی۔پریم چند نے اپنے صدارتی خطبے میں ادب کی غرض وغایت بیان کی ادیبوں کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور اس جلسے کو ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ قرار دیا۔اس کانفرنس میں شرکت کرنے والوں میں پریم چند کے علاوہ چودھری محمد علی، ردولوی سید سجاد ظہیر احمد علی، فراغ گورکھپوری، محمد الظفر، حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی اور بنگال، مہاراشٹر، گجرات، اور مدراس وغیرہ کے نمائندے شامل تھے۔اسی کانفرنس میں سجاد ظہیر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکریٹری منتخب کئے گئے۔یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد جو تحریکیں، جو ادارے تعطل اور انتشار کے شکار ہوئے ان میں ترقی پسند تحریک بھی کافی اہم ہے۔اس تحریک کے روح رواں سید سجاد ظہیر ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔بعض ادیب وشاعر نہیں رہے اور اسی طرح چھٹے دہے میں ہی نظریاتی اعتبار سے اس تحریک میں بکھراؤ کے آثار نظر آنے لگے۔

جوش کو شاعر انقلاب کہا جاتا ہے۔جوش کا انقلابی نظمیں لکھنے پر کچھ کو ملکی وعالمی ماحول نے اکسایا تو اقبال کی انقلابی نظموں نے ان کی رہنمائی کی لیکن چونکہ ان کے یہاں فکر وفلسفیانہ بصیرت کی کمی ہے اس لیے ان کے یہاں انقلاب کا کوئی واضح اور صحیح تصور نہیں ملتا اور وہ انقلاب کی روح تک پہنچنے میں ناکام رہتے ہیں۔جوشؔ کی انقلابی شاعری کو باغیانہ شاعری کا نام دینا مناسب ہوگا۔جوشؔ کی بعض نظمیں طنزیہ شاعری کی بہترین مثال ہیں۔جوشؔ کی شاعری کا

ایک پہلو جو ہمیں خاص طور سے متاثر کرتا ہے وہ ان کی منظر نگاری ہے۔ جوشؔ فطرت کے پرستار ہیں، انہوں نے فطرت کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا اور انھیں برتا۔ ان کی منظر نگاری میں ہمیں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ ان نظموں میں برسات کی شفق، ربودگی، جادو کی سرزمین، فتنہ خانقاہ، جھریاں، نا آشنا مہمان، برسات کی شام، جوانی کی آمد آمد، آوازوں کی سیڑھیاں، فاختہ کی آواز اور البیلی صبح وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

ترقی پسند شعراء میں وہ صفِ اوّل کے شاعر مانے جاتے ہیں۔ وہ نہ صرف بہترین نظم گو شاعر ہیں بلکہ انھوں نے غزل کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے غزل کی روایتی علامتوں کے پردے میں حکمرانوں کے جو ظلم و ستم 'لیلائے وطن سے محبت' آزادوطن کی سازشوں اور اپنی بے گناہی کا ذکر نہایت خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ زبان کا گداز، لہجے کی شیرینی اور جذبے کی دھیمی آنچ نے اُن کی شاعری کو دلکشی اور مقبولیت بخشی ہے، مظلوم و محروم لوگوں کے حقوق کی بازیابی اور ظلم و ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ 'نقشِ فریادی' 'دستِ صبا' 'زندان نامہ' 'دستِ تہہ سنگ' 'سرِ وادی سینا' شامِ شہر یاراں ان کے مشہور شعری مجموعے ہیں۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'میزان' صلیبیں میرے دریچے میں (بیوی کے نام لکھے خطوط کا مجموعہ) ان کا ادبی سرمایہ ہیں۔

مخدوم محی الدین کی بیشتر نظموں میں جمالیاتی کیف اور سرشاری کا انداز ملتا ہے۔ ان میں تازگی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک انقلابی مجاہد ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی بیشتر نظموں کو خشکی اور کرختگی سے بچالیا ہے۔ ان کی نظمیں طور، سجدہ، انتظار، محبت کی چھاؤں، نامہ حبیب، وہ، نورس اور پیشمانی، خوبصورت رومانی نظمیں ہیں۔ ان کی انقلابی نظموں مثلاً انقلاب، آتش کدہ قمر اور سپاہی اور اسٹالن اور آخری نظم ''چارہ گر'' میں تو غزلیہ عناصر کی موجودگی اسے خوبصورت فن پارہ بنادیتی ہے۔ کیفی اعظمی بھی مشہور ترقی پسند شاعر ہیں۔ ان کے یہاں بھی خطابت جھلکتی ہے۔ اس طرح کی نظموں میں ''مژدہ'' اور ''سپردگی'' شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کوریا کی نعرہ اور ''امین'' وغیرہ نظمیں بھی ہیں۔ جس سے وہ ترقی پسند شاعروں میں ممتاز رہے ہیں۔ ''جھنکار'' اور ''آخر شب'' ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

3.7 مشقی سوالات

۱۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز وارتقاء پر روشنی ڈالیے۔

۲۔ ترقی پسند تحریک کا پس منظر اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۳۔ جوشؔ ملیح آبادی کو انقلابی شاعر کہا جاتا ہے۔ واضح کیجیے۔

۴۔ فیض احمد فیضؔ کی ادبی خدمات مفصّل تحریر کیجیے۔

۵۔ مخدوم محی الدّین اور انکی نظم نگاری پر روشنی ڈالیے۔

3.8 فرہنگ

خمیر	مزاج
منظّم	وہ چیز جو انتظام کے ساتھ ہو۔
اشتراکیت	ایک اعتدال پسند نظریہ حیات جس کے مطابق ذرائع پیداوار پر عوام کی مشترکہ ملکیت ہونی چاہیے۔
تغزّل	غزل کے خمیر کو تغزل کہتے ہیں۔
امتزاج	ہم آہنگی
بگولہ	ہوا کا چکّر
مدعی	دعوا کرنے والا
زنداں	قید خانہ۔ جیل
سلاسل	بیڑیاں
سعی	کوشش
رودِ عمیق	گہرا دریا

3.9 سفارش کردہ کتب

1.	ترقی پسند مصنفین کی تحریک	سردار جعفری
2.	ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی
3.	ترقی پسند ادب	سردار جعفری
4.	ترقی پسند تحریک اور اُردو شاعری	یعقوب یاور

اکائی نمبر ۔ 4 (A)

رومانوی تحریک

اکائی کے اجزاء :

4.1 مقاصد
4.2 تمہید
4.3 رومانوی تحریک کا آغاز وارتقاء
4.4 رومانوی تحریک کے اہم شعراء ونثر نگار
4.4.1 نیاز فتح پوری
4.4.2 سجّاد حیدر یلدرم
4.4.3 مہدی افادی
4.4.4 اختر شیرانی
4.5 خلاصہ
4.6 نمونہ امتحانی سوالات
4.7 فرہنگ
4.8 حوالہ جاتی کتب

4.1 مقاصد:

☆ طلبہ رومانوی تحریک کیا آغاز وارتقاء سے واقف ہوں گے۔
☆ طلبہ رومانوی تحریک کے اہم شعراء کی ادبی خدمات سے واقف ہوں گے۔
☆ طلبہ رومانوی تحریک کے اہم نثر نگاروں سے واقف ہوں گے۔

4.2 تمہید :

رومانیت ایک جذبہ اور ایک طرز فکر کا نام ہے یہ منطقیت اور عقلیت پسندی کے غلبہ کے ردعمل میں وجود پذیر ہوئی۔ اٹھارہویں صدی کی کلاسیکی تحریک نے ادب کو متعدد مصنوعی قیود میں جکڑ رکھا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تخلیقی ابال جو زندگی کو تنوع عطا کرتا ہیں۔ ان پابندیوں میں اخراج کا راستہ نہ پا سکا۔ اسی جامد اور پابند فضاء سے ادب کی رومانی تحریک ابھری اس تحریک نے ذہنی طور پر محبوس انسان کی آزادی کا علم ہاتھوں میں لیا۔ اور اسے معاشرتی زنجیروں سے نجات دلانے کی سعی شروع کردی، چنانچہ جذبہ و تخیل سرمست پرواز کو ہیئت اور اسلوب کے جامد سانچوں میں پابند رکھنا ممکن نہیں رہا اور رومانیت کی تحریک کو روز بروز فروغ ملتا گیا۔

4.3 رومانوی تحریک کا آغاز وارتقاء :

رومانیت کی ابتداء کا سہرا روسو کے سر ہے۔ جس نے کائنات کو زنداں تصور کیا اور آزادی کا مرجع دل کو بنایا جس میں انسان کا آزاد تخیل خارج کے جبر سے آزاد تھا، روس نے یہ انقلابی نعرہ بھی دیا کہ ''انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جہاں دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے۔'' یہ نعرہ رومانوی تحریک کے لئے بانگ درا ثابت ہوا، اس کا اظہار ادب میں یوں ہوا کہ ادیب معاشرے کے مطابق خود کو ڈھالنے کے بجائے معاشرے کو اپنی داخلی آرزوؤں کے مطابق بدلنے کی کوشش کرنے لگا۔

رومانیت کی اساسی روح افلاطون کے نظریات میں موجود ہے، چنانچہ جب افلاطون نے انسان کو ایک ایسا پرندہ قرار دیا جو بے پر ہونے کے باوجود قوت پرواز رکھتا ہے تو درحقیقت انسان کے متخیلہ پر بلواسطہ مہر **تصدیق** ثبت کرتا

ہے۔رومانیت دراصل اس کیفیت کو پالینے کا نام ہے۔جب انسان کا مادی وجود ہمہ تن جذبہ میں تحلیل ہوکر جسم کو پر لگا دیتا ہے۔مغربی ادبیات میں جوشاعراورادیب رومانوی تحریک کوفروغ دینے میں آگے آگے نظر آتے ہیں ان میں ولیم بلیک،کولرج،ورڈسورتھ،شیلےاورکیٹس وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

رومانیت محض حیرت انگیز چیزوں کو وجود بخشنے سے عبارت نہیں بلکہ یہ زندگی کا ایک خاص رویہ ہے۔رومانیت میں آزاد روی اورانفرادیت،تحفظ ،انااور بغاوت کرتا ہے،تاریخ ادب شاہد ہے کہ معاشرہ اورادب جب بھی جمود کی زد میں آئے توایک رومانی تحریک ابال کی طرح نمودار ہوئی،اوراس نے اتنی تخلیقی سرگرمی پیدا کردی کہ معاشرے کا خارجی خول تڑخنے لگااورایک نئی تعمیر کے آثار نمودار ہوگئے۔

رومانی شعراء نے خیال،ہیت اورزبان کا پراناڈھانچہ بدل ڈالا،لفظ کی جامدصورت کوتصویری سیال کیفیت عطا کی اوراس ادیب موضوع کوتخلیق کےبطن سے دریافت کرتا ہے۔چنانچہ رومانی ادباء کے لئے کوئی موضوع شجرممنوعہ نہیں۔ اساسی اہمیت تخلیقی لمس کوحاصل ہے اور یہی موضوع کوتازگی اورتوانائی عطا کرتا ہے۔

جذباتی سطح پر رومانی نوعیت کا ردعمل کومثبت صورت میں محمدحسین آزاد،میرناصرعلی دہلوی اورعبدالحلیم شرر نے ابھارااوران اسالیب کوفروغ دینے کی سعی کی جن میں ادیب کا تخیل جذبہ کی جوئے تیزرو کے ساتھ چلتا ہےاورقلم اس کے وجدان سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔آزادکی خیال آفرینی کا سرچشمہ انگریزی انشاء پردازی سے پھوٹتا نظر آتا ہے،انھوں نے متّخیلہ کو پابندسلاسل کرنے کے بجائے آزادی پرواز عطا کی اور'نیرنگِ خیال' میں ایسی رنگین پناہ گاہیں تخلیق کیں جنھیں صرف وجدان کی داخلی نگاہ ہی سے دیکھا جاسکتا ہے۔

میرناصرعلی کوسرسیّد کے مشن سے تعرض نہ تھا،ان کا موضوع صرف ادب تھا،چنانچہ انھوں نے سرسیّد کے علمی و ادبی کارناموں پرنہ صرف سخن گسترانہ تنقید کی بلکہ سرسیّد کی سنجیدہ ونثر کا جامدخول توڑنے کی کوشش کی انھوں نے تہذیب الاخلاق کے مقابلے میں''تیرہویں صدی،فسانہ ایام اورصلائے عام وغیرہ رسائل جاری کئے اوران میں زبان کی خوبی کو خیال کی خوبی پرترجیح دینے کی کوشش کی،چنانچہ انھوں نے علی گڑھ تحریک کی خشک کلاسیکیت کونثر کی شاعری میں تبدیل کیا اورادب کی خارجی مادیت کا رخ داخل کی رومانیت کی طرف موڑ دیا،اس طرح میرناصرعلی نے رومانوی تحریک کوفروغ دینے میں نمایاں کردارکیا۔اردوادب میں رومانیت کےاولین نقوش تلاش کئے جانے پرنگاہ میرناصرعلی ہی پر جاکرٹھہرتی ہے۔انھیں نے عہد سرسیّد میں رومانیت کے اولین بیج بکھیرے۔عہد سرسیّد میں شدید جذباتی رویہ اور رومانی طرز

احساس کی ایک اور مثال عبدالحلیم شرؔر ہیں۔ شرؔر نے عام رومان پسندوں کی طرح اپنی روح کی آسودگی کا سامان اپنے شاندار ماضی میں تلاش کیا جیسا کہ انھوں نے اپنے ناول حسن انجلینا، منصور موہنا، فلورا فلورنڈا اور یوسف نجمہ وغیرہ میں اس دودھیا دھند کو پکڑنے کی کوشش کی جو بکھر کر تاریخ کی دھند میں گم ہو چکی تھی، شرؔر کے اندر ہیجان پسندی تھی اور یہ ہیجان پسندی ان کے رومانی مزاج کا بنیادی عنصر ہے، اور اس کا اظہار انھوں نے اسلامی تاریخی ناولوں میں فراوانی سے کیا ہے۔ شرؔر نے اسب کی ہیئت کو توڑا اور جذبہ و خیال کو ردیف اور قافیہ کی پابندی سے نجات دلانے کے لئے نظم معرٰی کی بنیاد ڈالی، اس طرح شرؔر کی رومانیت صرف اصناف نثر ہی میں نہیں ظاہر ہوئی بلکہ انھوں نے شاعری کو بھی تبدیلیوں سے آشنا کرنے کی کوشش کی، اردو زبان کی صحت، صفائی اور تراشیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں اشاریت اور ترنم و تکلم پیدا کرنے کی کوشش کی۔

بیسوی صدی رومانیت کے لئے کافی سازگار ثابت ہوئی۔ اس عہد کے حالات نے کو بے بس و مجبور بنا ڈالا تھا، فرد کی یہ بے بسی رومانیتکے فروغ میں کافی معاون ثابت ہوئی، چنانچہ اس دور میں ایسے بہت سے نوجوان ادیب نظر آتے ہیں جنھوں نے اُردو زبان کو ایک خاص قسم کی لطافت سے آشنا کیا اور طاقتور متخیلہ کے بل بوتے پر رومانی تصورات کو فروغ دینے کی سعی کی ان نوجوانوں میں اقبالؔ، ابوالکلام، آزادؔ، سجاد حیدر یلدرم، آغا شاعر قزلباش، ظفر علی خاں، مرزا محمد سعید، خوشی محمد ناظر، مہدی افادی، نیاز فتح پوری وغیرہ زیادہ اہم ہیں۔ اقبالؔ کی شاعری میں بھی رومانیت کا پرتو نظر آتا ہے، یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران وہ مغرب کے یونانی شعراء سے متاثر ہوئے، چنانچہ وہ نہ صرف اس شاعری کو پسند کرنے لگے بلکہ رومانیت نے ان کے قلب و ذہن پر قبضہ بھی جمالیا۔ اقبالؔ نے مشرقی انداز اظہار کو برقرار رکھتے ہوئے مغربی شاعری کے موضوعات کو اپنی تخلیقات میں سمونے کی کوشش کی۔ فطرت سے متعلق ان کی نظمیں ان کی رومانیت پسندی کا واضح ثبوت ہیں۔ ان کی وہ نظمیں بھی ان کی رومانیت پسندی کا مظہر ہیں جن میں وہ ماضی کی عظمت رفتہ کی بازیابی کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔

ابوالکلام آزادؔ کی نثر میں بھی رومانیت کے عناصر موجود ہیں۔ ''غبارِ خاطر'' میں رومانیت کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ وہ فطرت کی بزم نشاط میں کھوئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ماضی کی عظمت رفتہ کی بازیابی کی خواہش ان کی تحریروں میں جا بجا ملتی ہے، ان کی نثر میں تخیل کی فراوانی پوری کائنات کو سر کرنے کی کوشش کرتی ہے، ان کی نثر سطوت، جلوت اور عظمت کی مظہر ہے۔ رومانیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ محمد حسین آزادؔ، ناصر دہلویؔ اور عبدالحلیم شرؔر کا تعلق رومانیت کی صبح کاذب سے تھا تو اقبالؔ اور ابوالکلام آزادؔ نے اسے صبح صادق کا اجالا عطا کیا اور یلدرمؔ، سجاد

انصاری، مہدی افادی، حفیظ جالندھری اور نیاز فتح پوری کے عہد میں یہ تحریک نصف النہار کو پہنچی۔

رومانی تحریک سے وابستہ شعراء میں اقبالؔ کے علاوہ حفیظؔ جالندھری نے مادی ذرے سے نقاب اتارنے کی کوشش کی ہے، ان کی رومانیت ان معصوم حیرتوں سے عبارت ہے جو ان کے دل میں گردوپیش کے حسن کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ ان کی نظموں میں فطرت کا جمال ایک نغمہ سرمدی بن کے ابھرا ہے۔ جوشؔ کی رومانیت میں جذبے کا طوفانی وبال اساسی اہمیت رکھتا ہے، ان کی نظموں میں سیمابی اضطراب اور ہیجانی کیفیت ملتی ہے۔ اختر شیرانیؔ رومانیت کی توانا آواز ہے، ان کی رومانیت میں نسوانی حسن کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ ایک فطری رومان پرست کی طرح موجودات عالم سے مطمئن نظر نہیں آتے، چنانچہ دنیا ان کے لئے ایک نفرت گہہ ہستی اور لعنت گہہ عالم ہے اور اس دنیا سے دور ایک ایسی بستی آباد کرنا چاہتے ہیں جو پھولوں اور نکہتوں سے معمور ہے۔ مجازؔ اور ساغرؔ نظامی کی نظموں میں بھی رومانیت کے عناصر موجود ہیں، وہ اپنے سماج سے باغی نظر آتا ہے۔ خود بہت سے ترقی پسند شعراء بھی رومانیت کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔

اس طرح مغرب کی طرح ہندوستان میں بھی رومانی تحریک نے لفظ وخیال کی نئی جہتوں کو آشکار کیا، جذبہ کو بلند پروازی سکھائی۔ ادیب کو اپنے خارج سے داخل کی طرف جھانکنے اور پھر تخلیقی عمل یسے ان دونوں میں امتزاج پیدا کرنے کی راہ سجھائی۔ رومانی ادیبوں کی تحریروں کا جائزہ لینے پر محسوس ہوتا ہے کہ تمام ہی رومانی ادیبوں کے یہاں خیال کی آزادی اور جہانِ کہنہ کو شکست کے کر جہانِ نو کی تعمیر قدرِ مشترک کے طور پر موجود تھی۔

4.5 اُردو کے نامور رومانوی شعراء اور نثر نگار:

4.5.1 نیاز فتح پوری:

نیاز فتح پوری ہمہ جہت قسم کے ادیب تھے۔ وہ نقاد بھی تھے۔ فراست الید سے بھی واقف تھے۔ اور مذہبیات میں بھی دخل رکھتے تھے۔ لیکن ان کو شہرت ان کے ادب لطیف نے دی۔ جس کی امتیازی صفت ان کے جمالیاتی احساس کی شدّت ہے۔ وہ سجّاد حیدر یلدرم سے متاثر ہوئے۔ ''خارستان وگلستان'' کے مطالعہ کے بعد نیازؔ نے کی وپڈوسائکی انھوں نے یونانی علم الاصنام کی رومانیت اور حسن پرستی کو اپنے انداز سے پیش کیا۔ انکا انداز اگرچہ مبالغہ آمیز ہوتا ہے لیکن اس سے وہ دلوں کو چھونے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ عورت اور حسن وعشق ان کے خاص موضوعات ہیں۔ جہاں

ان کے تخیل کی طاقتِ پرواز اور جذبے کی شدّت کو موقع ملا ہے۔ انھوں نے حسن و عشق کے رنگ و نور پر سادیے ہیں۔ مگر جہاں حقائق کی دنیا میں پہنچتے ہیں اور سماج کی سمت میں آنکھیں کھولی ہیں پھسپھسے ہو گئے ہیں۔ انکے طرز میں ایک والہانہ پن ہوتا ہے۔ ایک استغراق اور محویت کی صورت ہوتی ہے۔ وہ اپنی عبارتوں سے ہمیں اس دنیا میں پہنچادیتے ہیں۔ جہاں سے کوئی کور ذوق ہی واپس آنا پسند کریگا۔ یلدرم کے علاوہ نیازؔ نے ٹیگورؔ سے بھی اثرات قبول کیے ہیں۔ نیازؔ نے گیتا نجلی کا عرض نغمہ کے نام سے ۱۹۱۴ء میں ترجمہ کیا۔ ان سب چیزوں نے مل کر نیازؔ کے اسلوب میں حسن کی چمک کو اور تیز کر دیا۔

نیازؔ فتح پوری تحریر کو دلکش بنانے کے لئے عربی فارسی الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔ نئی تراکیب اور نشانیاں کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جہاں الفاظ کا شکوہ دم توڑ دے ان کے جملوں کی دل کشی کا سایہ بجھ جاتا ہے۔

''ایک شاعر کا انجام'' نیازؔ کا پہلا ناولٹ ہے۔ جو ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں جذبات نگاری اسلوب کا حسن اور جمالیاتی احساس کی شدّت ہے۔ ''شہاب کی سرگذشت'' ان کا دوسرا ناولٹ ہے۔ اس میں ان کا اسلوب اپنی تمام رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

ان کے افسانوں اور انشائیوں کا مجموعہ ''نگارستان'' ہے۔ ان میں یونانی علم الاصنام پر مبنی افسانے بھی ہیں۔ آسکر وائلڈ اور وکٹر ہیوگو کے افسانوں اور اقوال کے ترجمے اور سماجی حقائق پر مبنی کہانیاں بھی۔ ان کے انشائیوں کی لطافت، حسنِ فطرت کی شگفتگی، شدّت جذبات اور جمالیاتی احساس کی فراوانی انھیں ادبِ لطیف کا ترجمان بنا دیتی ہے۔ چند دن بمبئی میں ''ایک مصور فرشتہ'' ''عورت'' 'برسات' ایک قافلہ صحراء کو دیکھ کر۔ کیوپڈ و سائکی ایک رقّاصہ سے۔ ایک شب کی قیمت، کہکشاں کا ایک سانحہ۔ قربان گاہ حسن۔ محبت کی دیوی۔ ایس مصلح بُت تراش۔ روح کی فریب کاریاں عالمِ محبت میں۔ وغیرہ انشائیہ اور افسانے ہیں۔

4.5.2 سجّاد حیدر یلدرم:

شررؔ کی قائم کی ہوئی روایت کو یلدرم نے ایک مستقل حیثیت دی۔ وہ ترکی معاشرت اور ترکی ادب کے شیدائی تھے۔ انھوں نے ترکی تخلیقات کے ترجمے کئے۔ ان کو ہندوستانی رنگ اور فضاء دی۔ اور اس طرح ترکی کی فضاؤں کو ہندوستانی مناظر کا رنگ بخش کر انھیں خالص اُردو کی چیز بنا دیا۔ ادبِ لطیف کو پروان چڑھانے، اسے وسعت دینے اور شررؔ کی روایت کی تکمیل کرنے والے یلدرم ہی تھے۔ اس لحاظ سے ادب لطیف کے والوں میں انکو سرخیل کی حیثیت

حاصل ہے۔ یلدرم کے یہاں لطافت بنیادی قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔اور حسن کی تکمیل کی خواہش ہر جگہ نمایاں ہے۔ تخیّل کی فراوانی اور جذبے کی شدّت قدم قدم پر ظاہر ہیں۔ان کے یہاں بھی عورت۔اور حسن وعشق کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ یلدرم کی پرورش اگر چہ ''تہذیب الاخلاق'' کے ماحول میں ہوئی مگر ان کے مذاق کی تربیت مغربیت نے کی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سرسیّداور شبلی سے زیادہ کیٹس اور بائرن سے قریب ہیں۔مگر شبلی کی شاگردی کا یہ فیض تھا کہ حسن کی تلاش وہ مشرق ہی میں کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان کی نظر تو مغربی ہے مگر ان کی لطافت پسندی اور خوش مذاقی نے اسے غزل کی 'نگمہ سرمہ سا' بنادیا۔

انھیں انا ترک کے ترکی سے شدید دلچسپی تھی۔اسی مناسبت سے ترکی ادب نے بھی انھیں اپنی طرف کھینچا اور انھوں نے متعدد ترکی ناولوں اور ڈراموں کے ترجمے بھی کئے اور ان سے اخذ واستفادہ بھی۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے ''خیالستان'' کی نئے سرے سے مرتب کر کے چند موہوم حقائق کی بنیاد پر یلدرم کو اُردو کا سب سے پہلا افسانہ نگار ثابت کرنا چاہا ہے۔

یلدرم کی تخلیقات میں ان کے افسانوں اور انشائیوں کے دو مجموعے ''خیالستان'' اور حکایات واحتساسات چار ترکی ناولوں کے ترجمے ''ثالث بالخیر'' 'زہرا' مطلوب حسیناں اور آسیب الفت' کے نام سیت ترکی ہی کے تین ڈراموں کے اُردو ترجمے جلال الدین خوارزم شاہ جنگ و جدل۔ اور پرانا خواب۔ اور محمد حجازی کے فارسی ناول کا اُردو ادب ''ہما خانم'' شامل ہیں۔ یلدرم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ترجموں کو تخلیق کا درجہ دے دیتے ہیں۔ترکی افسانوں ،ناولوں اور ڈراموں کو اس طرح ہندوستانی فضا بخشی ہیکہ وہ ہندوستانی معاشرے سے ہم آہنگ ہوگئے ہیں۔ فارسی ترجمے میں بھی انھوں نے ترجمے کا احساس نہیں ہونے دیا۔اس طرح انھوں نے اپنے زور قلم اور تحریر کی فسوں کاری سے طبع زاد اور ترجمہ شدہ تحریروں کا فرق مٹادیا۔تخیّل کی بلند پروازی نے ان میں بھی وہی لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کیں جو ان کی طبع زاد تخلیقات کا طرّہ امتیاز ہیں۔

"خیالستان'' پہلی مرتبہ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ایک نظم سمیت ۱۴ تخلیقات شامل ہیں۔ تیرہ نثری انشائیوں اور افسانوں میں سے چار صحبتِ ناجنس، خارستان وگلستان، نکاح ثانی ،ترکی سے ماخوذ ہیں۔ ''مجھے میرے دوستو سے بچاؤ'' طبع زاد تحقیقات ہیں۔ایک نظم ''مرزا پھوپا علی گڑھ'' میں بھی اس میں شامل ہے۔اس طرح یلدرم کی امتیازی صفت یہ ہے کہ ان کے ترجمے بھی ہندوستانی فضا سے اس طرح ہم آہنگ ہیں کہ وہ ترجمے سے زیادہ تخلیق معلوم ہوتے ہیں۔

4.5.3 مہدی افادی:

مہدی افادی کا سرمایہ تحریر زیادہ نہیں۔ایک ''افادیت مہدی'' کے نام سے انکے مضمونوں، انشائیوں اور تبصروں کا مجموعہ ہے۔اور دوسرا ان کے خطوط کا مجموعہ ''صحیفہ محبت'' کے نام سے لیکن اس کے باوجود اُردو انشا پردازی اور ادب لطیف میں اتنے قلیل سرمائے کے ساتھ صفِ اوّل میں جگہ حاصل کر لینا مہدی افادی ہی کی شوخی تحریر کا کرشمہ ہے۔وہ روشن خیال اور وسیع المطالعہ ادیب تھے۔ان کا شمار اہل علم میں ہوتا تھا۔وہ قدیم سرمایہ ادب اور مشرقی زبانوں کے قدرداں بھی تھے اور مغربی ادب پر بھی نظر رکھتے تھے۔ان کی تحریروں کے ساتھ ساتھ انکی پوری زندگی لطافت ونفاست میں ڈوبی ہوئی تھی۔انھوں نے نثر پارے بھی تخلیق کئے۔اور مختلیف علمی مضامین پر عالمانہ نظر ڈالی۔وہ ادب وشاعری کے واسطے سے تہذیب وتمدّن، احساسات وخیالات سبھی میں تغیّر لانا چاہتے تھے۔مگر ان کی رومانویت پر جمالیاتی احساس غالب تھا۔وہ حسن کے پرستار تھے اور اچھائیوں پر نظر رکھتے تھے۔وہ ظاہر اور باطن دونوں کی پاکیزگی کے قائل تھے۔ان میں انانیتی جذبہ شدید تھا۔وہ اپنی رائے پر حد درجہ اعتماد کرتے تھے۔شبلی جیسے عالم اور انشاء پرواز نے ان کی دل کھول کے تعریف کی۔وہ بھی شبلی کی عالمانہ نظر اور مورخانہ بصیرت کے قائل تھے۔وہ شبلی کو تاریخ کا معلم اوّل کہا تھے۔

انکا ذوقِ جمال خداداد تھا۔سنجیدہ اور عالمانہ مضامین میں بھی وہ پیرائیہ بیان ایسا لطف رکھتے ہیں کہ قلب و ذہن کے سارے تار جھنجھنا اٹھتے۔ان کی تحریروں میں جذبات کا وفود تھا۔انکے بہت سے پیراگراف، تراکیب اور لفظی تراجم ضرب المثل بن چکے ہیں۔''افادیت مہدی'' میں ۳۰ نثر پارے ہیں جن میں آدھے تو تبصرے ہیں۔باقی آدھے میں مضامین اور انشائیے ہیں۔ان کی تحریریوں میں نفاست اور ''اوّل درجیت'' اور جذبات کا وفود جملے جملے سے عیاں ہے۔پھر بھی اگر کسی طرح کی تقسیم کی جائے تو مضامین نو اور انشائیے چھ کہے جاسکتے ہیں۔''حکمائے یونان پر ایک نظر'' بیسویں صدی کا آغاز اور دماغی صحبت غیر فانیوں سے'' ''ترکوں کی معاشرت'' ''تنقیداتِ عالیہ'' ''اُردو لٹریچر کے عناصر خمسہ'' ''پروفیسر براؤن ''' ''تاریخ کا معلم اوّل'' ''شعرالعجم پر ایک فلسفیانہ نظر'' ''علامہ نذیر احمد اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام'' کے عنوانات سے مہدی نے مختلیف موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔اور ہر جگہ ادبی لطافت ونفاست کے اہتمام کا کرشمہ دامنِ دل کو کھینچتا ہے۔

4.5.4 اختر شیرانی:

اختر شیرانی کا پورا نام محمد داؤد خاں اختر شیرانی تھا۔انھوں نے اُردو نظم میں حالؔی کی اصلاحی روش کے برعکس داخلی جذبے کا اظہار کیا،انھوں نے نسوانی حسن اور عشق کی والہانہ کیفیات کو نظم کی صورت دی، اختر شیرانی حسین عورت کے پرستار اور اس سے باتیں کرنے کا مشتاق تھے۔ان کی زندگی رومانی بغاوت کی مثال تھی، وہ ٹونک میں پیدا ہوئے۔ان کے والد حافظ محمود شیرانی مطالعے میں رہنے والے محقق تھے، ردّعمل کے طور پر اختر شیرانی نے تعلیم سے فرار اختیار کیا۔ اور عشق اور خمریات میں پناہ حاصل کر لی اور آخر موت بھی کثرتِ مے نوشی کی وجہ سے ہوئی۔ان کی شاعری کی ممتاز کتابوں میں صبح بہار، اختر ستان، لالہ طور، طیور آوارہ، شہناز اور شہرود کا شمار ہوتا ہے۔اختر شیرانی کی شاعری میں کائنات عورت کے جمالیاتی روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔انھوں نے ایک خوابِ شیریں میں زندگی گزاری، محبوب کے ملاقات کی یاد کو ذہنی طور پر زندہ رکھا اور اس کی خدائی کو تسلیم کیا۔

حکیم نیّر واسطی نے اخؔتر کی محبوبہ سلمٰی کے حقیقی وجود کی نشاندہی کی ہے لیکن اس کی حیثیت ایک افسانے سے زیادہ نہیں، ان کی محبت افلاطونی اور عورت کا سراپا عنبریں دھند میں لپٹا ہوا ہے۔چنانچہ اخؔتر کے نہاں خانہ خیال میں ایک نہیں کئی محبوبائیں تھیں جن کا ذکر انھوں نے والہانہ انداز میں کیا۔

"اودیش سے آنے والے بتا''''جہاں ریحانہ رہتی ہے''''عورت اور پھول''''قلوپطرا''جوگن' اور اے عشق کہیں لے چل' جیسی نظموں میں اخؔتر نے پاپ کی نگری سے نکلنے اور ریحانہ، زہرہ اور سلمٰی جیسی کسی مہ جبیں کی زلفوں میں پناہ لینے کی آرزو کی ہے۔''اٹھ ساقی تلوار اُٹھا''''عشق آزادی اور شاعر''''جھونپڑی کا دیا' اور 'خرابی وتعمیر' جیسی نظموں میں اخؔتر شیرانی نے سیاسی اور انقلابی شاعر بننے کی کوشش کی لیکن یہ ان کا اصلی رنگ نظر نہیں آتا۔ان کی غزل کے جمالیاتی زاویوں میں عورت اور شراب کا پرتو جھلکتا ہے۔اُردو شاعری میں اخؔتر شیرانی کی عطا یہ ہے کہ انھوں نے جیتی جاگتی عورت کو نظم میں اہم موضوع کی حیثیت دی اور نا خارج سے باطن کو طرف موڑ دیا۔انھوں نے گیت میں تخلیقی اظہار کیا تو مفارقت سے ابھرنے والی یادوں کو اہمیت دی جس سے اُردو گیت کو نئی جہت مل گئی۔

4.6 خلاصہ:

رومانی شعراء نے خیال، ہیت اور زبان کا پرانا ڈھانچہ بدل ڈالا، لفظ کی جامد صورت کو تصویر کی سیال کیفیت عطا کی اور اس کی ظاہری پرت کے نیچے معنی کی ایک نئی دنیا دریافت کی۔ موضوعات کے زاویہ سے رومانی تحریک کی انفرادیت یہ ہے کہ ادیب موضوع کو تخلیق کے بطن سے دریافت کرتا ہے۔ انھوں نے سرسیّد کے علمی و ادبی کارناموں پر نہ صرف سخن گسترانہ تنقید کی بلکہ سرسیّد کی سنجیدہ ونثر کا جامد خول توڑنے کی کوشش کی انھوں نے تہذیب الاخلاق کے مقابلے میں ''تیرھویں صدی، فسانہ ایام اور صلائے عام وغیرہ رسائل جاری کئے اور ان میں زبان کی خوبی کو خیال کی خوبی پر ترجیح دینے کی کوشش کی، چنانچہ انھوں نے علی گڑھ تحریک کی خشک کلاسکیت کو نثر کی شاعری میں تبدیل کیا اور ادب کی خارجی مادیت کا رخ داخل کی رومانیت کی طرف موڑ دیا۔

عہد سرسیّد میں شدید جذباتی رویہ اور رومانی طرز احساس کی ایک اور مثال عبدالحلیم شرؔر ہیں۔ شرؔر نے عام رومان پسندوں کی طرح اپنی روح کی آسودگی کا سامان اپنے شاندار ماضی میں تلاش کیا جیسا کہ انھوں نے اپنے ناول حسن انجلینا، منصور موہنا، فلورافلورنڈا اور یوسف نجمہ وغیرہ میں اس دودھیا دھند کو پکڑنے کی کوشش کی جو بکھر کر تاریخ کی دھند میں گم ہو چکی تھی۔ اس دور میں ایسے بہت سے نوجوان ادیب نظر آتے ہیں جنھوں نے اُردو زبان کو ایک خاص قسم کی لطافت سے آشنا کیا اور طاقتور متّخیلہ کے بل بوتے پر رومانی تصورات کو فروغ دینے کی سعی کی ان نوجوانوں میں اقبال ، ابوالکلام، آزاؔد، سجاد حیدر یلدرم، آغا شاعر قزلباش، ظفر علی خاں، مرزا محمد سعید، خوشی محمد ناظر، مہدی افادی، نیاز فتح پوری وغیرہ زیادہ اہم ہیں۔ ابوالکلام آزاؔد کی نثر میں بھی رومانیت کے عناصر موجود ہیں۔ ''غبارِ خاطر'' میں رومانیت کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ وہ فطرت کی بزم نشاط میں کھوئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ماضی کی عظمت رفتہ کی بازیابی کی خواہش ان کی تحریروں میں جا بجا ملتی ہے، ان کی نثر میں تخیل کی فراوانی پوری کائنات کو سر کرنے کی کوشش کرنی ہے، ان کی نثر سطوت، جلوت اور عظمت کی مظہر ہے۔ جوشؔ کی رومانیت میں جذبے کا طوفانی وبال اساسی اہمیت رکھتا ہے، ان کی نظموں میں سیمابی اضطراب اور ہیجانی کیفیت ملتی ہے۔ اختر شیرانؔی رومانیت کی توانا آواز ہے، ان کی رومانیت میں نسوانی حسن کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

''خارستان وگلستان'' کے مطالعہ کے بعد نیاؔز نے کی وپڈوسائکی انھوں نے یونانی علم الاصنام کی رومانیت اور حسن پرستی کو اپنے انداز سے پیش کیا۔ انکا انداز اگرچہ مبالغہ آمیز ہوتا ہے لیکن اس سے وہ دلوں کو چھونے میں کامیاب

ہوجاتے ہیں۔عورت اور حسن وعشق ان کے خاص موضوعات ہیں۔ جہاں ان کے تخیل کی طاقتِ پرواز اور جذبے کی شدّت کو موقع ملا ہے۔انھوں نے حسن وعشق کے رنگ ونور پر سا دیے ہیں۔یلدرم کی تخلیقات میں ان کے افسانوں اور انشائیوں کے دو مجموعے ''خیالستان'' اور حکایات واحتساسات چارتر کی ناولوں کے ترجمے ''ثالث بالخیر'' 'زہرا' مطلوب حسیناں اور آسیب الفت' کے نام سیت ترکی ہی کے تین ڈراموں کے اُردو ترجمے جلال الدین خوارزم شاہ جنگ وجدل۔ اور پرانا خواب۔اور محمد حجازی کے فارسی ناول کا اُردو ادب ''ہما خانم'' شامل ہیں۔یلدرم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ترجموں کو تخلیق کا درجہ دے دیتے ہیں۔'اودیش سے آنے والے بتا'' ''جہاں ریحانہ رہتی ہے'' ''عورت اور پھول'' 'قلوپطرا' 'جوگن' اور اے عشق کہیں لے چل' جیسی نظموں میں اختؔر نے پاپ کی نگری سے نکلنے اور ریحانہ، زہرہ اور سلمٰی جیسی کسی مہ جبیں کی زلفوں میں پناہ لینے کی آرزو کی ہے۔''اٹھ ساقی تلوار اُٹھا'' ''عشق آزادی اور شاعر'' 'جھونپڑی کا دیا' اور 'خرابی وتعمیر' جیسی نظموں میں اختؔر شیرانی نے سیاسی اور انقلابی شاعر بننے کی کوشش کی لیکن یہ ان کا اصلی رنگ نظر نہیں آتا۔ان کی غزل کے جمالیاتی زاویوں میں عورت اور شراب کا پرتو جھلکتا ہے۔

4.7 نمونے امتحانی سوالات:

۱ .رومانوی تحریک کے آغاز وارتقاء پر سیر حاصل تبصرہ کیجیے۔

۲ ۔رومانوی تحریک کے اہم شعراء کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

۳۔ رومانوی تحریک کے اہم نثر نگاروں کا ادبی مقام بتایئے۔

۴۔ نیازؔ فتح پوری رومانوی تحریک کے اہم ادیب تسلیم کیے جاتے ہیں۔بحث کیجیے۔

۵۔ سجّاد حیدر یلدرم کی ادبی خدمات پر مفصل تبصرہ کیجیے۔

۶۔ 'افادیتِ مہدی'' کی روشنی میں مہدی افادی کی شخصیت پر نوٹ لکھئے۔

4.8 فرہنگ:

جمود جم جانا

فرسودہ پرانا۔خستہ حال

کدورت	دل کا غبّار، رنجش
قنوطیت	نا اُمیدی، مایوسی
تخیل	تصوّر۔خیال
مسرّت	خوشی۔شادمانی
دلدادہ	عاشق، فریفتہ

4.9 سفارش کردہ کتابیں:

رومانوی تحریک	محمد حسن
تاریخ ادبِ اُردو	نورالحسن نقوی

اکائی نمبر - 4(B)

اودھ پنچ میں طنز و مزاح

اکائی کے اجزاء۔

4.1 مقاصد

4.2 تمہید

4.3 اودھ پنچ میں طنز کا آغاز وارتقاء

4.4 اودھ پنچ سے وابستہ شاعر اور ادیب

4.4.1 منشی سجاد حسین

4.4.2 پنڈت رتن ناتھ شرشار

4.4.3 مُچھو بیگ ستم ظریف

4.4.4 منشی جوالا پرشاد برق

4.5 خلاصہ

4.6 نمونہ امتحانی سوالات

4.7 فرہنگ

4.8 سفارش کردہ کتابیں

4.1 مقاصد :-

☆ طلبہ طنز و مزاح کی تحریک سے واقف ہوں گے۔

☆ طلبہ پنچ سے وابستہ شاعر سے واقف ہوں گے۔

☆ طلبہ اودھ پنچ سے وابستہ ادیبوں کے کاموں سے واقف ہوں گے۔

4.2 تمہید :-

اودھ پنچ ۱۸۷۷ء میں منظر عام پر آیا اور اشاعت پذیر ہوتے ہی فضاء قہقہوں سے لبریز ہوگی۔طنز و مزاح کا ایک سیلاب تھا کہ مسکراہٹوں کا اپنے جلو میں لے امڈا اور چاروں طرف پھیل گیا۔اور شاعروں اور مضمون نگاروں کا ایک پورا گروہ طنزہ و مزاح کے حربوں سے ہوریوں اور بے اعتدالیوں کو نشانہ تمسخر بنانے لگا۔

4.3 آغاز وارتقاء :

یوں تو اودھ پنچ نے جو سجاد حسین کی مساعی سے منصۂ شہود پر آیا تھا۔طنز و مزاح لکھنے والوں کا ایک پورا حلقہ پیدا کیا جن میں شوق برق پیٹرٹ، ٹریڈ مارک، مولانا جنوبی، عرش، لال ابالی اور درجنوں دوسرے شعرا شامل تھے۔لیکن دیکھا جائے تو اس گروہ میں چار نام زیادہ ابھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ پنڈت تربھون ناتھ ہجر، احمد علی شوق، مولوی سید عبدالغفور شہباز اور لسان العصر اکبرالہٰ آبادی۔ان میں سے ہجر کی شہرت تحریف نگاری کے باعث ہے۔ان کی تحریفیں ان اولین تحریفوں میں سے ہیں۔ جو مغربی پیروڈی کی طرز پر لکھی گئیں۔ چناچہ ہجر کو پیروڈی کے جدید تصور کی ترویج کے سلسلے میں خاصی اہمیت حاصل ہے۔

اودھ پنچ کے دوسرے معاون احمد علی شوق ہیں جن کے کلام میں زیادہ تر اودھ کی کھوکھلی معاشرت اور اس کے نام لیواؤں کی بعض مکروہ عادات پر بھرپور طنز موجود ہے۔ بے شک انھوں نے مغربی میلانات کے بعض قابل اعتراض پہلوؤں کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔تاہم انھوں نے زیادہ تر اپنے معاشرے کو ہی پیش نظر رکھا ہے۔

اودھ پنچ کے تیسرے معاون مولوی سید عبدالغفور شہباز ہیں۔شہباز کی شاعری کا طرۂ امتیاز اس کے بے ساختگی ہے۔ وہ مذہب وملت کو بھی بسا اوقات نشانہ طنز بناتے ہیں۔اور ایسا محسوس ہوتا ہے گویا مذہب کی بعض سنگلاخی اقدار میں وہ لچک کے حامی تھے۔لیکن وہ بات کرتے وقت نہ صرف محتاط رہتے ہیں بلکہ بات کو ہلکے ہلکے مزاح سے ہم آہنگ کر کے نشتریت میں قابل برداشت ملائمیت آجاتی اور ردعمل کو تحریک نہیں ملتی۔

بولی قسمت فضول سب تقریر ایسی باتیں نظر میں ہاں کب ہیں
کالے گورے پہ کچھ نہیں موقوف دل کے آنے اور ہی ڈھب ہیں

اودھ پنچ کے اس دور کے چوتھے نامور نگار لسان العمر اکبرالہٰ آبادی ہیں۔لیکن اکبرالہٰ آبادی بجائے خود ایک

سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔اکبر کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کا عروج انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی کے خمس اول میں ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جس میں ہندوستانی تہذیب ومعاشرت مغربی رجحان کے زیر اثر راغب ہورہی تھی،ایسے میں اکبر کے ذہن میں اور بازو میں جنبش پیدا ہوئی اور طنز کے تیز اور نوکیلے تیروں کی بارش شروع ہوگئی۔اکبر کی شاعری کو عام طور پر بذلہ سنجی یا وٹ کی شاعری کہا گیا ہے۔اور وہ اس لئے کہ بیشتر موقوں پر انھوں نے تخیل اور معنی آفرینی کہ بجائے صرف شعیدہ بازیوں سے مزاح پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔مثلاً۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں　　اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑھ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا　　کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا۔

تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں مزاح کو تحریک دینے والی چیز شاعر کے سخن ہائے گنتی کی بے ساختگی نہیں بلکہ اس کی خوی ضاعت اور انداز پیش کش ہے۔دراصل اس قطع کا سارا حسن اس کی رعایت لفظی میں ہے۔

پس ہنگامی واقعات اور اکابر کے طرز عمل پر طنز کی اس روش کو مولانا شبلی اور ان کے بعد مولانا ظفر علی خان نے ہی پروان چڑھایا اور ہنگامی معاملات پر طنزیہ لہجے میں اظہار خیال کرتے رہے۔ظفر علی خان کی نظموں میں توسمیت کا عنصر غالب ہے لیکن شبلی کا کلام اس عنصر سے بڑی حد تک پاک ومحفوظ ہے۔

نثار ہا اور وہ غور سے میرا کلام اور　　پھر وہ کہا جو لائق اظہار بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا　　لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ظریف لکھنوی کا نام اودھ پنچ کے دوسرے دور سے وابستہ ہیں۔وہ ان سماجی بے اعتدالیوں کو نشانہ طنز بناتے ہیں۔جو زمانے کے انحطاطی رجحانات سے جنم لیتی اور ہنگامی واقعات کے پس پشت زندہ قائم رہتی ہے۔مثال کے طور پر ان کی نظمیں،سیاست ظریف،شہتا شعرب،اور الیکشن،کسی خاص سیاحت واقعی یا الیکشن کی روندا د بیان نہیں کرتیں۔

اردو کی طنز شاعری میں اکبرالہٰ آبادی کی اجتہادی روش کے بعد اگلا اہم قدم علامہ اقبال نے اُٹھایا جب انھوں نے اُردو شاعری میں طنز کو عالمگیر انسانی مسائل سے روشناس کرانے میں کامیابی حاصل کی علامہ اقبال کی طنزیہ شاعری میں سنجیدگی اور ظرافت کا امتزاج ان کی فطری مستحل مزاجی اور اعتدال کا غماز ہے۔اس طریق کار کی ایک اچھی مثال ان کی نظم 'نصیحت' ہے جس میں انھوں نے طنز کرنے کے لئے ایک نیا زاویہ منتخب کیا۔

میں نے اقبال سے از راہ نصیحت یہ کہا　　عامل روزہ ہے تو اور نہ پابند نماز
تو بھی ہے شیوہ ارباب ریا میں کامل　　دل میں لندن کی ہوس لب پہ ترے ذکر حجاز

سنجیدگی اور ظرافت کا یہ امتزاج اقبال کی شاعری کے لئے دوسری باتوں کے علاوہ خیالات کی ندرت تشبیہات کی تازگی، الفاظ کا صحیح استعمال، ذہنی رفعت اور وسیع تر انداز نظر کی بھی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ اودھ پنچ کی شاعری میں طنزیہ و مزاجیہ عنصر کافی ترقی کرتا ہوا ہمیں نظر آتا ہیں۔ یوں تو اودھ پنچ کا دور خاصا طویل دور ہے۔ اور یہ انیسویں صدی کے مربع آخر کے علاوہ بیسویں صدی کے خمس اول پر بھی حاوی ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اختتام کے لگ بھگ اودھ پنچ کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ اور اردو عشر میں طنز و مزاح کا عبوری دور شروع ہو گیا تھا۔

اردو نثر میں طنز و مزاح کے عبوری دور کے لکھنے والوں میں مہدی افادی، محفوظ علی بدایونی خواجہ حسن نظامی، سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم، منشی پریم چند، سجاد علی انصاری، قاضی عبدالغفار اور ملا رموزی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہ ہمیں ان میں سے بیشتر کی تحریروں میں ایک بدلا ہوا طنزیہ و مزاحیہ لہجہ ملتا ہے۔

ان لکھنے والوں میں مہدی افادی اور محفوظ علی بدایونی نے اگر چہ مزاح نگاری کے میدان میں سنجیدگی سے قدم نہیں رکھا تاہم ان کی انشا میں مزاح کی ایک باریک سی درخشندہ لکیر اودھ پنچ کے بلند اور خیر دکن شعلوں سے قطعاً علیحدہ نظر آتی ہے۔ اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ اردو نثر کے اس دور میں طفلانہ قہقہوں پر بلوغت کے متانت آمیز تبسم نے اپنا تسلط قائم کرنا شروع کر دیا ہے۔

مہدی افادی کی بہ نسبت میر محفوظ علی بدایونی کی تحریروں میں مزاح کے نقوش زیادہ واقع ہیں تاہم محفوظ علی بدایونی کے یہاں بھی مزاح نگاری کا وہ رنگ موجود نہیں جو واقعہ یا موازنہ سے تحریک لیتا ہے۔ اس کے برعکس ان کی مزاح نگاری زیادہ تر اسٹائل کی رنگینی شگفتگی اور بے ساختگی سے پیدا ہوتی ہے۔

محفوظ علی بدایونی کی نفیس اور شستہ ظرافت کے بعد خواجہ نظامی کی چٹکیوں اور گدگدیوں کا تذکرہ ایسا ہی ہے جیسا ایک جوئے رواں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے یک لخت ایک طرف کو ہٹ کر کسی ٹھہرے ہوئے تالاب کے پاس آجانا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی ظریفانہ تحریروں میں بالعموم لفظی صنعت گری اور آمد کا اقرار کیا ہے۔

سلطان حیدر جوش بھی اس دور کے لکھنے والوں میں سے ہیں اور اگر چہ وہ بحیثیت افسانہ نگار مقبول خاص و عام ہوئے لیکن ان کی شہرت ایک حد تک ان مضامین کے ذریعے بھی پھیلی جو 'الناظر' وغیرہ میں چھپے اور اپنی شگفتگی اور طنز و مزاح کے باعث بڑے شوق سے پڑھے گئے۔

اردو نثر میں طنز و مزاح کے اس عبوری دور میں دو فن کار البتہ ایسے ہیں جو اپنے زمانے سے کچھ آگے اور اردو نثر کے دور جدید سے قدرے قریب نظر آتے ہیں۔ یہ ہیں منشی پریم چند اور سجاد انصاری منشی پریم چند کے یہاں ایک ایسا سماجی شعور ہے جو ان کے معاصرین کی تحریروں میں موجود نہیں۔ پریم چند کی نظر اپنے ماحول کی ناہواریوں پر مرکوز ہے۔ اور وہ ہمیں سماج کے ناسوروں کی طرف متوجہ کرنے کی برابر کوشیش کرتے نظر آتے ہیں۔ چناچہ جزئیات نگاری ماحول کا پر خلوص تجزیہ اور کرداروں کے دھڑکتے ہوئے دلوں سے ہم آہنگی۔ یہ تمام باتیں ان کی تحریر میں طنز کی وہ تلخی پیدا کر دیتی ہیں۔ جو ان کے اپنے دور کے دوسرے لکھنے والوں میں موجود نہیں، پس اُردو میں طنز و مزاح کے عبوری دور میں پریم چند کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کی تحریروں میں طنز کا رخ واضح طور پر سیاسی مسائل کی بجائے سماجی مسائل کی طرف پلٹنا نظر آتا ہے۔ پریم چند طنز کہ اس سماجی رنگ کے سب سے بڑے پیشرو ہیں۔

منشی پریم چند کی طرح سجاد علی انصاری کی تحریروں پر بظاہر سنجیدگی کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اور انھیں مزاح نگار یا طنز نگار کہتے ہوئے سخت ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ تاہم ان کے یہاں بت شکنی کہ اتنے واضح رجحانات ملتے ہیں اور وہ مقبول عام انسانی نظریات کا دوسرا رخ دیکھانے پر اس قدر مستعدر ہتے ہیں کہ ان کی نگارشات تلخ اندیشی کے بہت قریب جا پہنچتی ہیں۔

طنز و مزاح کہ اس عبوری دور کے آخری دو لکھنے والے قاضی عبدالغفار اور ملا رموزی ہیں۔ قاضی عبدالغفار کی حقائق پر بڑی کڑی گرفت ہیں۔ اور سیاسی زندگی کے تجربات وطن پرستی کے جذبات اور فلسفے سے فطری لگاؤ نے ان کی نگارشات میں پختگی، رچاؤ اور نتیجہ ایک طنزیہ کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ خیالات پر کڑی گرفت اور اظہار و بیان پر مکمل عبور کہ باعث قاضی عبدالغفار کی تحریر میں بھی مزاح کی یہی کیفیت نظر آتی ہیں۔

اردو نثر میں طنز و مزاح کے طالب علم کہ لیے ملا رموزی کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا زبان و بیان سے منزل پیدا کرنا ہے۔ وہ دراصل اپنی گلابی اردو کے لئے مشہور ہیں۔ یہ گلابی اردو قرآن مجید کے قدیم اُردو ترجمہ کی پیروڈی ہے۔

4.4 اردو پنچ طنز و مزاح شاعر و ادیب

مطالعہ کریں جو تہذیب الخلاق کے پرچوں کی زینت بنے تو ہمیں الفاظ کہ پس پشت ایک نا قابل بیان عزم کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔ قوم کو قعر مذلت سے اُٹھا کر بامِ ثریا تک پہنچانے کہ اس عزم نے ان کی نگارشات میں سنجیدگی کی ایک لہر دوڑا دی ہے اور اسی لیے ان کی نثر میں غالب کی سی لطافت یا رنگینی موجود نہیں۔ تاہم بعض بعض خطوط میں مزاح

کی ایک ہلکی سی روضرور نظر آتی ہے۔مثلاً جب وہ لندن میں اپنے مکتوب میں گردن مروڑی مرغی کا ذکر کرتے ہیں ان کا زہر خند صاف نظر آجاتا ہے۔اسی طرح بعض اوقات سنجیدہ باتوں کے درمیان کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ دیتے ہیں کہ پڑھنے والے کے ہونٹ ازخود تبسم میں بھیگتے چلے جاتے ہیں۔مولوی سید مہدی علی کے نام جو خطوط ہے ان میں یہ کیفیت بڑی نمایاں ہے لیکن علی گڑھ کے زمانے کے خطوط میں سنجیدگی نے نور ظرافت کی اس ابھتی ہوئی شعاع کو قریب قریب ختم کردیا ہے۔پس اردو ونثر میں مزاح نگاری کا جائزہ لیتے وقت جب مولوی نذیر احمد یا سرسید احمد خاں کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی مزاحیہ صلاحیتوں کا ان کے مقصد کی سنجیدگی نے قلع قمع کردیا اور یہ اچھا ہو یا برا اس کا تو تاریخ ہی فیصلہ کریگی البتہ طنز ومزاح کے اس طالب علم کو اس بات کا افسوس ضرور ہے پس یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ غالب کہ بعد اردو نثر میں مزاح نگاری کا اگلا دور اودھ پنچ سے ہی شروع ہے اور اگر چہ بقول چکبست اودھ پنچ کے ظریفوں کی شوخ وطرارطبیت کا رنگ غالب سے کہیں مختلف ہیں اور ان کے قلم سے پھبتیاں ایسی نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر لیکن اگر اس وقت کی سوسائٹی کو مدنظر رکھ کر اودھ پنچ کے علمبرداروں کی نگارشات کا جائزہ لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کے یہ حیثیت مجموعی اس اخبار نے اردو زبان میں ایک بھرپور طنزیہ انداز اختیار کیا ایک ایسے وقت میں جب کہ زندگی میں انقلاب انگیز تبدیلیاں پیدا ہورہی تھی فضا کو اعتدال پر لانے کی کوشش کی۔

4.4.1 رتن ناتھ سرشار

اودھ پنچ کے اس دور کے سب سے اہم لکھنے والے رتن ناتھ سرشار تھے لیکن سرشار کے ہاں طنز کم اور مزاح زیادہ ہے پھر ان کے مزاح میں بھی غالب کے مزاح کی سی لطافت اور رعنائی موجود نہیں بلکہ یہ بلند بانگ قہقہوں کا محرک ہے سرشار کا مغربی مصنفین سے اگر مقابلہ کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی ظرافت میں ایڈیسن کی لطافت کی بجائے والٹیر کی تیزی موجود ہے۔وہ اس مہربان سی مسکراہٹ کو تحریک نہیں دیتے جو اپنی صدائے بازگشت سے لمحہ بہ لمحہ بلند تر اور تیز تر ہوتا چلا جاتا ہے۔تا آنکہ اس کی گونج ایک ابدی لے کی طرح تمام فضاء پر محیط ہوجاتی ہے اور ناظر اس کے طلسم ہو شربا میں بے اختیار بہنے لگتا ہے۔بیشک اس گونج میں گہرائی موجود نہیں ہے تاہم اس کی بلند بانگ اور نوکیلی کیفیت کا احساس ہوجاتا ہے اور دراصل یہی کیفیت سرشار کی ظرافت کا طرۂ امتیاز بھی ہے

جیسا کہ مزکور ہوا سرشار کی تحریروں میں طنز کی فراوانی نہیں ، تاہم جب وہ لکھنو کی زوال پذیر معاشرت کی تصویریں کھینچتے ہیں اور نوابوں کی مکروہ عادات، چانڈو، افیون بیڑ بازی کی طرف ان کے رجحانات، عام شہریوں کی اوہام پرستی مذہبی رسوم کی پابندیوں میں ان کا استغراق معلمین کی جہالت، پیروں کی بداعمالی، اور شاعروں، وکیلوں اور بانکوں

کے مخصوص نظریات کو طشت از بام کرتے ہیں تو ان کی طنز کی نشتریت صاف محسوس ہونے لگتی ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے خوجی اور آزاد کے جو متضاد کردار پیش کئے ہیں، ان کی مدد سے وہ ایک طرف تو لکھنو کی پرانی تہذیب کو ہدف طنز بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں اور دوسری طرف اس نئے سماجی شعور کا بے رحم نفسیاتی تجزیہ بھی کر گئے ہیں جو اس زمانے میں بڑی شدت لیکن ایک عجیب سے کے ڈھنگے طریق سے نمودار ہو رہا تھا۔ ان کا کردار خوجی رانی تہذیب کا علمبردار ہے اور اس میں سستی، بزدلی اور ناکردگی کے تمام عناصر یکجا ہو گئے ہیں۔ دوسری طرف آزاد نئے سماجی شعور کا علمبردار ہے اور بنیادی طور پر اپنے زمانے کے اس عام انسان کی طرح ہے جس نے ماضی کے بندھنوں کو توڑ لیا تھا۔ لیکن جو ابھی مستقبل سے کوئی پائدار رشتہ استوار نہیں کر سکا تھا۔ اور نتیجۃً مضحکہ خیز طریق سے لڑکھڑاتا پھرتا تھا۔ خورشید الاسلام صاحب کی رائے میں سرشار نے اپنے زمانے کے ان دونوں واضح رجحانات پر طنز کرنے کے لئے دو طرح کے آئینے استعمال کئے، ایک آئینے میں انھیں ہر چیز مضحکہ چیز حد تک چھوٹی نظر آئی اور اس لئے انھوں نے خوجی سے علامت کا کام لیا، دوسرے میں انھیں ہر شئے مضحکہ خیز حد تک دیو قامت نظر آئی اور یہاں انھوں نے آزاد کو علامت قرار دیا اور یوں ان دونوں کرداروں کا سہارا لے کر ماضی و مستقبل، مشرق و مغرب اور پرانے اور نئے نظام کو بالعموم علیحدہ علیحدہ اور کبھی کبھی متصادم حالات میں پیش کرتے اور اپنے پڑھنے والوں کی تفریح طبع کے لئے سامان بہم پہنچاتے رہے مگر اس خاص زاویئے سے قطع نظر جب ہم سرشار کے ہاں ان مرقعوں کو دیکھتے ہیں جن میں انھوں نے مختلف واقعات و افراد کو ہدف طنز بنایا تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ سرشار کی اس طنز میں شدت کا فقدان ہیں۔ اس کے برعکس یہاں منظر کشی پر نسبتاً زیادہ محنت صرف کی گئی ہے سرشار بھی غالباً اس کمی کو محسوس کرتے ہیں، اور اپنی طنز میں شدت پیدا کرنے کے لیے تنقید اور تبصرے سے کام لینے لگتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ ناصح یا محتسب کا روپ دھار لیتے ہے اور یہ چیز نہ صرف ان کی تخلیقات کو فنی لحاظ سے کمزور کر دیتی ہے۔ بلکہ اس سے ان کی طنز کی ہمہ گیری پر بھی حرف آتا ہے۔

طنز بہ نسبت سرشار کے ہاں مزاح کی فراوانی ہے اور اگر چہ یہاں بھی ہو مزاح میں گہرائی پیدا نہیں کر سکے اور بعض اوقات تو ان کے مزاح کا معیار بہت پست بھی ہو جاتا ہے۔ تاہم ان کے ہاں واقعے سے پیدا ہونے والے مزاح کے بے شمار نمونے موجود ہیں۔ اور ان میں سے بعض خاصے اچھے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے مزاحیہ کردار سے بھی مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اور خوبی، نواب کھوسٹ شوہر، زرد پوش، مہراج بلی، اور ان جیسے درجنوں دوسرے افراد پیش کئے ہیں۔ جو اپنی فطری ناہمواریوں کے باعث مزاحیہ کردار کے بہت قریب جا پہنچتے ہیں۔ اور تو اور ''افسانہ آزاد'' کا ہیرو آزاد جس کے کردار کی تعمیر میں سرشار نے خاصی محنت کی ہے۔ اپنی بعض ناہمواریوں کے طفیل اگر مزاحیہ کردار نہیں تو

کم از کم ایک مضحکہ خیز شخصیت ضرور نظر آنے لگتا ہے۔ مزاحیہ کرداروں کے علاوہ سرشار کی تحریروں میں قدم قدم پر ایسے مضحکہ خیز واقعات بھی نظر آتے ہیں۔ جو ناظر کو ہر دم مسکرانے اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد بلند بانگ قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ لیکن سرشار کی نگاری کا ایک عیب بہ ضرور ہے کہ اس کے ذریعے بیشتر اوقات ''واقعے کی بجائے''، عملی مذاق'' سے مزاح پیدا کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ چنانچہ خوبی جوان کی ظرافت کا سب سے بڑا معاون ہے قدم قدم پر عملی مذاق سے دوچار ہوتا اور ہمیں اپنے مسخرے پن سے ہنسانے کی کوشش کرتا ہے، دراصل عملی مذاق سے پیدا ہونے والا مزاح لفظی بازی گری کی طرح کا مزاح کا کوئی بلند معیار پیش نہیں کرتا اور اسی لئے سرشار کے مزاح کا معیار بھی بالعموم عملی مذاق کی سطح پر پہنچنے کے بعد اپنی جاذبیت کھونے لگتا ہے۔

لیکن سرشار کی سب بڑی جیت ان کا اسلوب بیان ہے انھیں زبان پر بڑا عبور ہے اور وہ زبان و بیان سے ظرافت پیدا کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے نتیجتہ ان کی تحریروں میں ہر ہر قدم پر حاضر جوابی، ضلع جگت، پھبتی، اشعار کا بے تکا استعمال، لطائف، فارسی، اور اردو کا مضحکہ خیز امتزاج، تلفظ اور الفاظ کا الٹ پھیر۔۔۔ اور اسی وضع کے بیشما ر دوسرے حربوں سے پیدا شدہ مزاح کے کامیاب نمونے ملتے ہیں۔ مگر خوبی کی بات یہ ہے کہ یہ تمام حربے ان کے ظریفانہ اسٹائل کا جزو ہو کر رہ گئے ہیں اور مخمل میں ٹاٹ کا پیوند معلوم نہیں ہوتے۔ سرشار کے ظریفانہ اسٹائل کی اسی کامیابی کا نتیجہ ہے کہ فسانہ آزاد میں اس کی طوالت اور تکرار کے باوجود شگفتگی قائم رہتی ہے۔ بلا شبہ یہ سرشار کا ظریفانہ انداز تحریر ہے جس نے اس کی نثر میں یکسانیت پیدا نہیں ہونے دی۔ ورنہ جہاں کہیں وہ ظریفانہ انداز کو بالائے طاق رکھکر سنجیدہ باتیں کہنے کی کوشش کرتے ہیں وہیں ناظر کو ایک اکتاہٹ سی محسوس ہونے لگتی ہے اور اس کے لئے سرشار کی اس نوع کی تحریر کو پڑھنا مشکل ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل بھی ذکر ہوا اردو نثر میں غالب کے بعد مزاح نگاری کا اگلا دور اودھ پنچ ہی سے شروع ہوتا ہے۔ رتن ناتھ سرشار بھی اس دور کے لکھنے والے ہیں۔ اگر چہ ان کی بیشتر تحریریں ''اودھ اخبار'' میں چھپیں جس کے وہ ایڈیٹر بھی تھے لیکن ''اودھ پنچ'' نثر میں مزاح نگاری کے سلسلے میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سجاد حسین اس کے ایڈیٹر تھے اور اس کے نثر نگار معاونین میں سجاد حسین کے علاوہ تربھون ناتھ ہجر، مرزا مچھو بیگ، ستم ظریف، بابو جوالا پرشاد برق، احمد علی شوق، منشی احمد علی کسمنڈوی اور نواب سید محمد آزاد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اردو شاعری میں طنز و مزاح کا جائزہ لیتے وقت ہم نے اودھ پنچ کو سنگِ میل قرار دیا تھا۔ اور نثر کے ضمن میں بھی اس بات کو دہرایا ہے۔ یہ بات البتہ قابلِ غور ہے کہ شاعری میں اودھ پنچ سے پہلے طنز و مزاح کہ ایسے بہت سے نمونے ملتے ہیں جن میں سے کچھ تو فارسی ادب کے زیر اثر نمودار ہوئے اور کچھ اردو کے بعض عظیم شاعروں کے منفرد اندازِ نظر کے طفیل

منصۂ شہود پر آئے ۔لیکن نثر میں اودھ پنچ سے پہلے بجز خطوط غالب ہمیں طنز ومزاح کا کوئی اہم نمود نہیں ملتا اس لحاظ سے اودھ پنچ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ نثر میں طنز ومزاح کو رائج کرنے میں اس اخبار نے بہت بڑی خدمت انجام دی

4.4.2 منشی سجاد حسین

اودھ پنچ اپنے زمانے کی انقلابی تبدیلیوں کے خلاف ردِعمل کے طور پر نمودار ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں زندگی سے شگفتگی اور آسائش چھین لی تھی اور اس کے چہرے پر سنجیدگی کی تیوریاں پیدا کر دی تھیں۔ سیاسی ،سماجی، اور ادبی ماحول میں بھی سنجیدگی اور انہماک کا دور دورہ تھا، انتہا پسندی اپنے جوبن پر تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا باہر شخص اس طوفانی بہاؤ کے ساتھ ایک تنکے کی طرح بہتا چلا جائے گا۔ ایسے میں اودھ پنچ نے فرد کو روک کر اس کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھما دیا۔ اور اس سے درخواست کی کہ وہ ایک لمحہ کے لئے اس آئینے میں اپنی صورت دیکھنے کی تکلیف گوارہ کرے۔ ظاہر ہے جب اسے آئینہ میں ایک انتہائی سنجیدہ چہرا مضحکہ انگیز حرکات کرتا نظر آیا تو فرد کو ندامت بھی محسوس ہوئی اور اس کے جوش وانہماک میں اعتدال بھی پیدا ہو گیا۔ چناچہ اودھ پنچ نے قوم کے طوفانی دریا کو کناروں سے چھلکنے اور یوں تباہی و بربادی پھیلانے سے بروقت روکنے کی انتہائی کوشش کی۔ اور اس دریا سے طنز وظرافت کی بیشمار چھوٹی چھوٹی نہریں نکال کر اس طغیانی میں دھیما پن پیدا کرنے کا قابل رشک کام سرانجام دیا۔

اودھ پنچ کے ذریعے یہ تاریخی کام سجاد حسین کی مساعی کا رہین منت ہے۔ سجاد حسین خود بلا کہ لکھنے والے تھے اور وہ آج بھی ''حاجی بغلول''، ''طرحدار لونڈی''، ''احمق الدین'' کے مصنف حیثیت سے مقبول خاص و عام ہے۔ ان تصانیف کہ علاوہ انھوں نے جو خطوط ہندوستانی رؤسا کہ نام لکھے وہ بھی انتہائی دلچسپ اور طنزیہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں اودھ پنچ میں ''لوکل'' اور ''موافقت زمانہ'' کے زیرعنوان جو مضامین چھپتے تھے ان میں ملک میں سیاسی ،موسمی اور سماجی حالات پر وہ بڑی دلیری سے طنز کرتے تھے۔

سجاد حسین نے اودھ پنچ کو اپنے زمانے کا نہایت ہر دل عزیز پرچہ بنا دیا تھا چناچہ وہ کم وبیش چھتیس برس تک اس پرچہ کے ذریعے ملک وقوم کی خدمت سرانجام دیتے رہے اور اگرچہ اس دوران میں اودھ پنچ نے بیشتر اوقات لوگوں پر کیچڑ بھی اُچھالی، بیشتر اوقات اس کی طنز میں زہرناکی کا عنصر بھی نمودار ہوا، تاہم اردو نثر میں طنز ومزاح کے سلسلے میں اس کی خدمت سے انکار ممکن نہیں۔

۴.۴ منشی جوالا پرشاد برق

یوں تو اودھ پنچ نے اپنے پہلے دور میں بیشمار لکھنے والے پیدا کئے لیکن جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ہے ان میں

سجاد حسین کہ علاوہ مچھو بیگ، تربھون ناتھ، ہجر، جوالا پرشاد برق، احمد علی شوق، اور نواب سید محمد آزاد کے نام زیادہ مشہور ہوئے ان میں سے مچھو بیگ نے ''ستم ظریف'' کہ فرضی نام سے کئی برس تک اودھ پنچ میں مضامین لکھے کہ اپنی بول چال، مہاورے کی صفائی اور مزاح کی دھیمی دھیمی آنچ کے لئے بہت مشہور رہوئے ہیں۔ تربھون ناتھ، ہجر نے عام ظریفانہ نثر نگاری میں ''فسانہ آزاد'' کا انداز اختیار کیا اور رئیسوں کی مکروہ عادات افیون اور چانڈو کی طرف ان کا میلان اور زمانے کہ دوسرے انحطاطی رجحانات کا مذاق اُڑایا تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہجر کی تحریروں میں سرشار کی سی روانی پیدا نہ ہوسکی۔ (جوالا پرشاد برق نے یوں تو تراجم میں نام پیدا کیا لیکن اودھ پنچ کے صفحات میں انھوں نے سیاسی اور ملکی مسائل پر بھی تیز تیز نشتر چلائے۔) اسی طرح احمد علی کسمنڈوی نے اودھ کی کھوکھلی معاشرت کو حدف طنز بنانے میں کامیابی حاصل کی مگر اودھ پنچ کے ان سب معاونین میں نواب محمد آزاد کی تحریروں کو نسبتاً زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ دراصل اودھ پنچ کے اس دور میں اگر کسی شخص کو صحیح طور پر طنز نگار کہا جاسکتا ہے تو وہ نواب آزاد ہے۔ اور اگر چہ بعض مقامات پر ان کی طنز کا انداز بالواسطہ ہیں اور انھوں نے ایک تیز اور درشت لہجہ بھی اختیار کیا ہے۔ تاہم بہ حیثیت مجموعی ان کے یہاں زہرنا کی اور کینہ پروری کہ عناصر بہت کم ہے۔ اپنے مضامین میں آزاد نے مغربی تہذیب کہ علاوہ اپنی تہذیب کو بھی ہدفِ طنز بنایا ہے۔ چناچہ جہاں ان کے خطوط میں جو انھوں نے ''لندن'' سے تحریر کی مغربی تہذیب کا خاکہ اُڑایا گیا ہے وہاں ان کے ناول ''نوابی دربار'' میں اودھ کی نوابی زندگی پر طنز کی گی ہے علاوہ ازیں عبید زاکانی کی تحریفات کے انداز میں ایک ''ڈکشنری'' بھی لکھی ہے جس میں انتہائی ظریفانہ انداز میں بعض تلمیحات کہ معنے بتائے ہیں۔ اودھ پنچ کے ان معاونین کی طنزیہ وہ مزاحیہ انداز تحریر کا ہلکہ سا اندازہ ان اقتباسات سے ممکن ہے:

''ہم سے نگوڑی کبوتری اچھی جب دیکھا کبوتر اس کے گرد پھرتا ہے چونچ سے کھینچتا جاتا ہے۔ جو بن دیکھتا ہے اور تو اور اپنے پیٹ کا دانا اس کے منہ میں اُگل آپ بیچارہ بھوکا رہتا ہے۔ پھر یہ ایک پیارا خلاص ہی نہیں۔ بچے پالیں۔ تنکے چونچ میں اُٹھالائے، ڈربے میں گھر بنائے، انڈے سیا کریں۔ کبوتری ذرا باہر نکلی اور غوں غوں اپنی زبان میں بلاتا ہے۔ زبان تو ہیں نہیں کہ کہیں۔ مطلب یہ کہ تو کیوں تکلیف کرتی ہے یہی چین سے بیٹھی رہو اور مزا یہ کہ وہ قطامہ ادھر کا رخ نہیں کرتی، بھاگتی ہے۔ دس دفع کی خوشامد درآمد میں ایک دفع شاید یہ بھی چونچ سے چونچ سے ملا دیتے ہوگی۔ اور بڑی بڑائی ادھر کی اُدھر اتراتی دم لٹکائے تیرتی پھرتی ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ دو تین مرتبہ میں نے خود کہا کہ کیوں صاحب تم نے تو اب سب کہیں کا آنا جانا اُٹھنا بیٹھنا چھوڑ ہی دیا۔

4.5 خلاصہ :

اودھ پنچ نے اپنے پہلے دور میں بیشمار لکھنے والے پیدا کئے لیکن جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ہے ان میں سجاد حسین کہ علاوہ مچھو بیگ، تربھون ناتھ، ہجر، جوالا پرشاد برق، احمد علی شوق، اور نواب سید محمد آزاد کے نام زیادہ مشہور ہوئے ان میں سے مچھو بیگ نے ''ستم ظریف'' کہ فرضی نام سے کئی برس تک اودھ پنچ میں مضامین لکھے کہ اپنی بول چال، مہاورے کی صفائی اور مزاح کی دھیمی دھیمی آنچ کے لئے بہت مشہور رہوئے ہیں۔ تربھون ناتھ، ہجر نے عام ظریفانہ نثر نگاری میں ''فسانہ آزاد'' کا انداز اختیار کیا پنڈت تربھون ناتھ ہجر، احمد علی شوق، مولوی سید عبدالغفور شہباز اور لسان العمر اکبرالہٰ آبادی۔ ان میں سے ہجر کی شہرت تحریف نگاری کے باعث ہے۔ ان کی تحریفیں ان اولین تحریفوں میں سے ہیں۔ جو مغربی پیروڈی کی طرز پر لکھی گئیں۔ چناچہ ہجر کو پیروڈی کے جدید تصور کی ترویج کے سلسلے میں خاصی اہمیت حاصل ہے۔ اودھ پنچ کے دوسرے معاون احمد علی شوق ہیں جن کے کلام میں زیادہ تر اودھ کی کھوکھلی معاشرت اور اس کے نام لیواؤں کی بعض مکروہ عادات پر بھرپور طنز موجود ہے۔ اودھ پنچ کے تیسرے معاون مولوی سید عبدالغفور شہباز ہیں۔ شہباز کی شاعری کا طرۂ امتیاز اس کے بے ساختگی ہے۔ وہ مذہب وملت کو بھی بسا اوقات نشانہ طنز بناتے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے گویا مذہب کی بعض سنگلاخی اقدار میں وہ لچک کے حامی تھے۔ اردو کی طنز شاعری میں اکبرالہٰ آبادی کی اجتہادی روش کے بعد اگلا اہم قدم علامہ اقبال نے اُٹھایا جب انھوں نے اُردو شاعری میں طنز کو عالمگیر انسانی مسائل سے روشناس کرانے میں کامیابی حاصل کی علامہ اقبال کی طنزیہ شاعری میں سنجیدگی اور ظرافت کا امتزاج ان کی فطری مستحل مزاجی اور اعتدال کا غماز ہے۔

مہدی افادی کی بہ نسبت میر محفوظ علی بدایونی کی تحریروں میں مزاح کے نقوش زیادہ واقع ہیں تاہم محفوظ علی بدایونی کے یہاں بھی مزاح نگاری کا وہ رنگ موجود نہیں جو واقعہ یا موازنہ سے تحریک لیتا ہے۔ اردو نثر میں طنز ومزاح کے عبوری دور کے لکھنے والوں میں مہدی افادی، محفوظ علی بدایونی خواجہ حسن نظامی، سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم، منشی پریم چند، سجاد علی انصاری، قاضی عبدالغفار اور ملا رموزی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہ ہمیں ان میں سے بیشتر کی تحریروں میں ایک بدلا ہوا طنزیہ ومزاحیہ لہجہ ملتا ہے۔ سنجیدگی اور ظرافت کا یہ امتزاج اقبال کی شاعری کے لئے دوسری باتوں کے علاوہ خیالات کی ندرت تشبیہات کی تازگی، الفاظ کا صحیح استعمال، ذہنی رفعت اور وسیع تر انداز نظر کی بھی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ اودھ پنچ کی شاعری میں طنزیہ ومزاحیہ عنصر کافی ترقی کرتا ہوا ہمیں نظر آتا ہیں۔

سرشار کی تحریروں میں طنز کی فراوانی نہیں، تاہم جب وہ لکھنو کی زوال پذیر معاشرت کی تصویریں کھینچتے ہیں اور

نوابوں کی مکروہ عادات، چانڈو، افیون بیڑ بازی کی طرف ان کے رجحانات، عام شہریوں کی اوہام پرستی مذہبی رسوم کی پابندیوں میں ان کا استغراق معلمین کی جہالت، پیروں کی بداعمالی، اور شاعروں، وکیلوں اور بانکوں کے مخصوص نظریات کو طشت از بام کرتے ہیں تو ان کی طنز کی نشتریت صاف محسوس ہونے لگتی ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے خوجی اور آزاد کے جو متضاد کردار پیش کئے ہیں، ان کی مدد سے وہ ایک طرف تو لکھنو کی پرانی تہذیب کو ہدف طنز بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں اور دوسری طرف اس نئے سماجی شعور کا بے رحم نفسیاتی تجزیہ بھی کر گئے ہیں جو اس زمانے میں بڑی شدت لیکن ایک عجیب سے کے ڈھنگے طریق سے نمودار ہو رہا تھا۔ اودھ پنچ کے ذریعے یہ تاریخی کام سجاد حسین کی مساعی کا رہین منت ہے۔ سجاد حسین خود بلا کہ لکھنے والے تھے اور وہ آج بھی ''حاجی بغلول''، ''طرحدار لونڈی''، ''احمق الدین'' کے مصنف حیثیت سے مقبول خاص و عام ہے۔ ان تصانیف کہ علاوہ انھوں نے جو خطوط ہندوستانی رؤسا کہ نام لکھے وہ بھی انتہائی دلچسپ اور طنزیہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں اودھ پنچ میں ''لوکل'' اور ''موافقت زمانہ'' کے زیر عنوان جو مضامین چھپتے تھے ان میں ملک میں سیاسی، موسمی اور سماجی حالات پر وہ بڑی دلیری سے طنز کرتے تھے۔

4.6 نمونہ امتحانی سوالات :

۱۔ اودھ پنچ میں طنز و مزاح کا آغاز و ارتقاء کس طرح ہوا۔ مفصل لکھیے۔

۲۔ منشی سجاد حسین کی ادبی خدمات پر سیر حاصل تبصرہ کیجیے۔

۳۔ اودھ پنچ میں طنز و مزاح تحریک میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کی کارکردگی پر روشنی ڈالیے۔

۴۔ منشی جوالا پرشاد برق پر مختصراً نوٹ لکھیے۔

4.7 فرہنگ:

محرک	حرکت دینے والا
منصۂ شہود	وہ جگہ جہاں کسی چیز کا جلوہ دکھایا جائے۔
اوہام	وہم کی جمع۔ ذہنی تصور

4.8 حوالہ جاتی کتب:

۱۔اُردو ادب میں طنز و مزاح — وزیر آغا
۲۔رومانوی تحریک — محمد حسن
۳۔تاریخ ادبِ اُردو — نورالحسن نقوی

SHIVAJI UNIVERSITY, KOLHAPUR

شیواجی یونیورسٹی ، کولھا پور

B.A. PART - III

بی۔ اے ۔ سال سوم

SEMESTER - V

PAPER NO. XV

URDU ADAB KI TAHERIKAT

اردوادب کی تحریکات

Dr. Sajid Ali Qadri

Head Of Department, Urdu

S.P.D.M. College, Shripur. Dhule

مصنف :۔ ڈاکٹر ساجد علی قادری

(صدر شعبہء اردو)

ایس۔پی۔ڈی۔ایم۔کالج،شرپور۔ضلع دھولیہ

SHIVAJI UNIVERSITY, KOLHAPUR

(B.A. Part-III Urdu- Paper..X.&XV)

P.no – X. DSE-E34 Paper –

Title : Urdu ki Adbi Tahriken. DSE-E159 Paper – XV

Urdu ki Adbi Tahriken

Author's/Editor's name:

Dr. Sajid Ali Qadri
Dr.Ateeq Ahmed Qureshi

Published by:

Dr. V. N. Shinde
Registrar
Shivaji University, Kolhapur-416 004

Printer's Details:

Shri. B. P. Patil
Superintendent
Shivaji University Press, Kolhapur-416 004

Edition-1st

ISBN: 978-93-92887-72-7

CENTRE FOR DISTANCE EDUCATION

SHIVAJI UNIVERSITY, KOLHAPUR

Copyright ©Registrar, Shivaji University, Kolhapur. (Maharashtra)

SHIVAJI UNIVERSITY, KOLHAPUR

شیواجی یونیورسٹی ، کولھا پور

B.A. PART - III

بی۔ اے ۔ سال سوم

SEMESTER - V

PAPER NO. XV

URDU ADAB KI TAHERIKAT

اردو ادب کی تحریکات

Dr. Sajid Ali Qadri

Head Of Department, Urdu

S.P.D.M. College, Shirpur. Dist. Dhule

مصنف :۔ ڈاکٹر ساجد علی قادری

(صدر شعبۂ اردو)

ایس ۔پی۔ڈی۔ ایم۔ کالج ، شیرپور ضلع دھولیہ

پیش لفظ

بی اے سال اول اور سال دوم کی نصابی کتب کے مطالعہ کے بعد طلباء اردو ادب کی اصنافِ سخن سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں اور اب اس قابل ہو گئے ہیں کہ وہ اردو ادب کی تحریکات اور اس سے وابستہ شعراء کے فن اور شخصیت کے بارے میں واقفیت حاصل کریں۔ اسی مقصد کے تحت اس کتاب میں اردو زبان و ادب کی مختلف اہم تحریکات کے بارے میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ جس میں بالخصوص اکبر الہ آبادی کی مزاحیہ شاعری، ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور ان دونوں تحریکات سے وابستہ شعراء و ادباء کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

یہ کتاب مذکورہ بالا موضوعات پر مشتمل ہے جو بی اے ڈگری سال سوم کے نصاب میں شامل ہیں جو عام طور پر اردو ادب کی اہم تحریکات کے بنیادی پہلوؤں پر بحث کرتی ہے۔ نصاب کو سہولت کی خاطر ابواب اور ذیلی اکائیوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ماہرین نے اکائیوں کی تیاری ایک خاص ڈھنگ سے کی ہے۔ جس کا خاکہ اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ طلباء زیادہ دشواری کے بغیر نہ صرف ان اکائیوں کو پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہو جائیں بلکہ اس بات سے بھی آگہی حاصل کر لیں کہ کس موضوع پر تحقیق کیوں کر اور کیسے کی جائے۔ اس کے لئے ہر باب کے اختتام پر اپنی ترقی کی جانچ کرنے کے لئے ''اکائی کے اہم سوالات'' کے زیر عنوان سوالات دیئے گئے ہیں۔ ان سوالات کے جوابات لکھنے کے لئے جگہ دی گئی ہے۔ طلباء کو چاہئے کہ دی گئی جگہ میں اپنے جوابات لکھیں۔

توقع کرتی ہے کہ زیر نظر پیش کردہ نصابی مواد، موضوع کے تعلق سے معلومات حاصل کرنے میں طلباء کے لئے زیادہ کارآمد اور مفید ثابت ہوگا۔

نصاب کے مقاصد

یہ کتاب اسپیشل مضمون 'اردو' کے سلسلہ کا ایک جزو ہے جو بی اے سال سوم کے پرچہ پنج ازدہم سے تعلق رکھتی ہے ۔اس کتاب میں (۴) چار ابواب ہیں اور ان کے تحت (۳۲) ضمنی اکائیاں شامل ہیں۔

اس کتاب میں درج ابواب میں بالترتیب پہلا باب جو درج کیا گیا ہے وہ باب نمبر ا ہے۔ یہ باب 'اکبر الہ آبادی اور ان کی مزاحیہ شاعری' پر مشتمل ہے۔اس میں کل (سات) اکائیاں شامل ہیں جن کے تحت اکبر الہ آبادی کی شخصیت اور ان کی مزاحیہ شاعری کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد باب نمبر ۲ ہے جو ترقی پسند تحریک اور اس سے وابستہ نثر نگار' پر مشتمل ہے۔اس میں کل (۹) نو اکائیاں شامل ہیں۔جن کے تحت موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کے بعد باب نمبر ۳ ہے اور اس میں بھی (سات) اکائیاں شامل ہیں جن کے تحت ترقی پسند تحریک اور اس سے وابستہ شعراء' پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کے بعد کتاب ہذا کا آخری باب یعنی باب ۴ درج کیا گیا ہے اور اس میں جملہ (۹) اکائیاں شامل ہیں جن کے تحت جدیدیت کے بارے میں مفصل بیان کیا گیا ہے۔

ہر باب کے خلاصے کے بعد فرہنگ دی گئی ہے جس کے تحت مشکل الفاظ و اصطلاحات کے معنی و مطلب کو درج کیا گیا ہے۔

طلبہ کی سہولت کے لئے ہر اکائی کے آخر میں اہم سوالات دیئے گئے ہیں تا کہ طلبہ ان اسے استفادہ حاصل کریں اور مطالعہ کردہ معلومات کی خود ہی جانچ کر سکیں۔

اسی طرح ہر باب کے اختتام پر طلبہ کو مزید مطالعہ اور استفادہ کیلئے سفارش کردہ کتابوں کے

نام درج کر دیئے گئے ہیں۔

توقع کی جاتی ہے کہ زیر نظر پیش کردہ نصابی مواد، موضوع کے تعلق سے معلومات حاصل کرنے میں طلباء کے لئے زیادہ کارآمد اور مفید ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر ساجد علی قادری

بی۔ اے۔ سال دوّم (سمیسٹر سوّم)

TAREEKH-E-URDU ZABAN-O-ADAB

فہرست
برائے نصاب

اردو ادب کی تحریکات

Page No.	CHAPTER	ابواب	نمبر شمار
7	Akber Ilahabadi Ki Tanziha Wa Mazahia Shairi	اکبر الٰہ آبادی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری	1
15	Taraqqui Pasand Urdu Shair	ترقی پسند اردو شاعر	2
29	Taraqqui Pasand Urdu Nasar Nigar	ترقی پسند اُردو نثر نگار	3
39	Jadeediat Ka Rujhan Aur Oska Aagaz O Irteqa	جدیدیت کا رجحان اور اس کا آغاز و ارتقاء	4

باب نمبر: 1

اکبر الٰہ آبادی کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری

اکائی کے اجزاء:

1.1 مقاصد
1.2 تمہید
1.3 اکبر الٰہ آبادی کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری
1.4 خلاصہ
1.5 نمونہ امتحانی سوالات
1.6 فرہنگ
1.7 خود جانچنے کے سوالات
1.8 حوالہ جاتی کتب

1.1 : مقاصد

☆ طلباء طنزیہ ومزاحیہ شاعری سے واقف ہوں گے۔
☆ طلباء اکبر الٰہ آبادی کی شاعری سے واقف ہوں گے۔
☆ طلباء اُردو ادب میں اکبر الٰہ آبادی کے ادبی مقام سے واقف ہوں گے۔

1.2 : تمہید

کسی زبان کے سنجیدہ ادبی سرمایہ میں نہ صرف وہ خالص تخلیق مواد ملتا ہے جسے ادیب کا جذباتی اور احساسی انہماک جنم دیتا ہے بلکہ اس کا معتد بہ حصّہ اس تنقیدی مواد پر بھی مشتمل ہوتا ہے جو ادیب کی قوت مشاہدہ اور ذہنی

ادراک کا رہینِ منّت ہے۔ موخرالذکر ادبی سرمائے میں طنزیہ و مزاحیہ ادب بھی شامل ہے اور یہ انہی کا سہارا لے کر ادیب ماحول کی بے اعتدالیوں اور فرد کی ناہمواریوں پر نظر احتساب ڈالتا ہے۔ اس میں فرق صرف یہ ہے کہ تنقیدی ادب اپنے سنجیدہ عناصر کے باعث ایک ردعمل کو بھی تحریک دے سکتا ہے لیکن طنزیہ و مزاحیہ ادب ملائمت اور نشتریت کے ایک خوشگوار امتزاج کے باعث قابل برداشت ہوتا ہے اور کسی ناگوار ردّعمل کو تحریک نہیں دیتا۔

طنز و مزاح کا یہ سرمایہ نہ صرف کسی زبان کے نشوونما ارتقاء کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اہلِ زبان کے تدریجی ذہنی ارتقاء کو سمجھنے میں بھی مدد دیتا ہے۔ چنانچہ یہ لازم ہے کہ اس سرمایہ کا کما حقہ جائزہ لیا جائے۔ اس کے آبدار موتیوں کو خذف ریزوں سے جدا کیا جائے اور تنقید اور تبصرہ سے اس کی ممتاز خصوصات کو اس انداز سے اجاگر کیا جائے کہ نہ صرف اس سرمایہ کی ادبی اہمیت واضح ہو جائے۔

1.3 : اکبر اِلٰہ آبادی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری

اکبر اِلٰہ آبادی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا عروج انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی کے خمس اوّل میں ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی سماجی، مذہبی، سیاسی اور معاشی زندگی کی سنگین دیواروں میں مغرب کی طرف سے بڑھتے ہوئے سیلاب نے ایسے شگاف پیدا کر دئے تھے کہ معاشرے کی ساری عمارت کے گر جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایسے میں اکبر کے ذہن اور بازو میں جنبش پیدا ہوئی اور طنز کے تیز نوکیلے تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔ اس مقام پر ہم ابھی اس بحث کو زیر بحث نہیں لائیں گے کہ اکبر اِلٰہ آبادی کی طنز کے پس پشت جو رجحانات تھے وہ درست اور حق بجانب تھے یا نہیں۔ یہ بحث ہم آگے چل کر چھیڑیں گے۔ یہاں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اِن کی طنزیہ شاعری کو طنز و مزاح کے نقطۂ نظر سے کیا مقام حاصل ہے یعنی اس کا تمام تر مدار لفظی بازی گری پر ہے وہ مواد اور خیال کے سیکھے پن سے بھی کوئی مضحک پہلو پیدا کرتی ہے؟

لفظی بازی گری سے پیدا ہونے والے مزاح کے سلسلے میں اس بات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ اس میں بالعموم الفاظ کے بگاڑ، رعایت لفظی، تضمین، تصرف، محاورہ اور دوسری لفظی شعبدہ بازیوں سے کام لے کر ''مزاحیہ نکتے'' پیدا کیے جاتے ہیں اور یہ طریق کار بحیثیت مجموعی ''بذلہ سنجی'' کہلاتا ہے۔ وٹ کو برمحل حاضر جوابی فقرہ بازی

یا ''لفظوں کا کھیل'' سمجھنا چاہیے۔ لفظوں کا ایجاز و اختصار بذلہ سنجی کی سب سے ضروری شرط ہے اور اس کے لیے یہ تضمین، تصرف اور محاورہ کے حربے استعمال کرتی ہے مگر مزاح اور بذلہ سنجی میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ مزاح ایک برقی رو کی طرح سارے کے سارے مزاحیہ پارے میں جاری و ساری ہوتا ہے اور ہم کسی ایک مقام پر انگلی رکھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہاں مزاح موجود ہے۔ اس کے برعکس بذلہ سنجی کا دائرہ محدود ہوتا ہے اور اس کو علیحدہ کر کے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں کسی زبان کا مزاح ایک ''کیفیت'' ہونے کی وجہ سے دوسری زبانوں میں بھی منتقل ہو سکتا ہے لیکن بذلہ سنجی کا رشتہ الفاظ سے اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ ترجمے کی صورت میں یہ اپنے بہت سے نوکیلے نکات کھو بیٹھتی ہے اور اس سے حوصلِ مزاح کے امکانات بڑی حد تک روبہ زوال ہو جاتے ہیں۔

اکبر الٰہ آبادی کی شاعری کو عام طور پر بذلہ سنجی یا وٹ کی شاعری کہا گیا ہے اور وہ اس لیے کہ بیشتر موقعوں پر انھوں نے تخیّل اور معنی آفرینی کی بجائے صرف لفظی شعبدہ بازیوں سے مزاح پیدا کرنے کی سعی کی ہے، مثلاً جب وہ کہتے ہیں :

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں — اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں مزاح کو تحریک دینے والی چیز شاعر کے سخن ہائے گفتنی کی بے ساختگی نہیں بلکہ اس کی خوبی صناعت اور انداز پیش کش ہے۔ دراصل اس قطعے کا سارا حسن اس کی رعایت لفظی میں ہے ورنہ ہو سکتا ہے کہ پردے کے متعلق اکبر کے خیالات محض ایک خاص رُجحان کے غماز ہوں اور مزاح سے تہی۔

اکبر الٰہ آبادی کی شاعری میں خالص بذلہ سنجی کے ایسے اشعار بہت زیادہ ہیں اسی لئے بعض حلقوں میں اکبر الٰہ آبادی کی شاعری کو بذلہ سنجی قرار دے کر اسے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں ایک پست مقام دلانے کی سعی کی گئی ہے۔ لیکن ہم ان کے کلام کے اس بہت بڑے حصّے کو کیسے نظر انداز کر دیں جس میں اسلوب کی بہ نسبت خیال اور مواد پر زیادہ توجہ صرف ہوئی۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ان کے کلام میں ''بذلہ سنجی'' مقصود بالذات نہیں بلکہ اسے زیادہ تر طنز یا مزاح کی تخلیق میں حربے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً ان کا ایک مشہور شعر ہے :

یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام　　یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے پھیلا کیا ہے

بادی النظر میں ہم اس شعر کے حسنِ ادا سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن درحقیقت اس کی اہمیت اس طنز کے باعث ہے جس کی تخلیق میں حسنِ ادا نے محض حربہ کا کام دیا ہے۔ اسی تصرف کی یہ مثالیں لیجیے۔ ان میں چوٹ کے حربوں نے طنز کی تخلیق میں مدد بہم پہونچائی ہیں۔ مومنؔ کا مشہور شعر تھا :

کسی نے گر کہا مرتا ہے مومنؔ　　کہا ہم کیا کریں مرضی خدا کی

اکبرؔ الٰہ آبادی نے اس میں تھوڑا سا تصرف کیا اور طنز کا ایک بھرپور وار کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئے۔

اکبرؔ الٰہ آبادی کے طنز کے بارے میں ایک قابل غور نکتہ یہ ہے کہ کہیں کہیں اس کے پسِ پشت مجروح شخصیت اور احساس کمتری کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ غالباً اس کی وجوہ ان کی زندگی کا نفسیاتی مطالعہ کرنے پر بے نقاب ہو سکتی ہیں اور یہ کام ماہرین نفسیات کا ہے۔ تاہم اس مقام پر یہ نکتہ خیال انگیز ہے کہ اُردو کے تین ائمہِ طنز یعنی سوداؔ، انشاؔ اور اکبرؔ الٰہ آبادی کی شاعری کے طنزیہ و مزاحیہ عناصر ایک حد تک ان کی ''مجروح شخصیت'' کی پیداوار ہیں۔ سوداؔ، ہجو کے ذریعے اپنے معاصرین کو نشانۂ تمسخر بنانے کی کاوش زیادہ تر اسلئے کرتے ہیں کہ میرؔ کے سامنے انکا چراغ نہیں جل سکا۔ انشاؔ کی کینہ پروری اس لئے ہے کہ اپنی لازوال ذہنی صلاحیتوں کے باوصف وہ فطری طور پر دوسروں کی تذلیل سے لذّت حاصل کرتے تھے۔ رہے اکبرؔ الٰہ آبادی تو ان کے زمانے کے حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ سرسیّد کی طرح وہ بھی قومی ترقی پر اپنی توجہ مبذول کرتے اور اپنی قوم کو مغرب کے بعض ترقی پسند رجحانات سے قریب تر لانے میں معاون ثابت ہوتے۔ ہوا یہ کہ ''یارانِ تیز گام'' تو برق رفتاری سے اس راستے پر گامزن ہو گئے اور اکبرؔ الٰہ آبادی اپنی زنجیروں میں ہی جکڑے رہ گئے۔ ایک طرح سے زندگی کے اس بڑے موقع کو گنوا کر اکبرؔ الٰہ آبادی نے اپنی تگ و تاز کے میدان کو خود ہی محدود بھی کر لیا۔ لاشعوری طور پر انھیں اس بات کا افسوس تھا۔ چنانچہ ایک وفادار چیلے کی طرح سرسیّد کی تحریک میں شامل ہونے کی بجائے انھوں نے اس ساری تحریک اور اس کے پس منظر یعنی مغربی تہذیب کے رجحانات ہی کو ہدف طنز بنانے کا آغاز کیا اور اگرچہ اپنے خانگی معاملات میں انھوں نے مغربی رجحانات کی اس شدومد سے مخالفت نہیں کی۔

مگر اس بات سے قطع نظر کہ اکبر الٰہ آبادی کے اس مخصوص طنزیہ طریقِ کار کے پس پشت جو جذبہ کارفرما تھا وہ درست اور حق بجانب تھا یا نہیں۔ یہ بات یقیناً کہی جاسکتی ہے کہ ان کے طنز نے تعمیری کام سرانجام دیا۔ وہ اس طرح کہ اگرچہ ان کے لئے مغربی تہذیب کے سیلاب کو روکنا ممکن نہیں تھا اور نہ اس سیلاب کا رک جانا ہی ہماری ترقی کے لئے سودمند تھا۔ تاہم اس سیلاب کی تندی اور شدّت میں دھیما پن پیدا کرنا واقعی ضروری تھا اور اکبر الٰہ آبادی کے عقائد اور مقاصد چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہوں یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی طنز نے مغربی تقلید کی طوفانی رو میں دھیما پن ضرور پیدا کیا اور یوں اپنے ملک کی ان ادبی، تمدّنی اور مذہبی روایات کا تحفظ کیا جو بصورت دیگر یکسر فنا ہو جاتیں۔ اس ضمن میں اکبر الٰہ آبادی مرحوم کا وہ حصّۂ کلام بھی قابلِ توجہ ہے جس میں انھوں نے مغرب کو طنز کا نشانہ بنانے اور مشرق کو ایک مقامِ بلند پر دکھانے کی بجائے ان دونوں میں مطابقت پیدا کرنے کا درس دیا۔ محمد احسن فاروقی کا خیال ہے کہ اپنے اس کلام کی بدولت ''اکبر الٰہ آبادی'' محض بدلتی ہوئی قدروں کے ترجمان سے آگے بڑھ کر دائمی قدروں کے طرفدار دکھائی دیتے ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے متعلق ایک آخری نکتہ یہ ہے کہ اگرچہ اکبر الٰہ آبادی مغرب اور مغربیت کے سب سے زیادہ مخالف تھے تاہم وہ پہلے اُردو شاعر ہیں جو باقاعدہ طور پر اکابر کے طرزِ عمل اور ہنگامی واقعات پر طنز کی طرف متوجہ ہوئے۔

دراصل وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ ہندوستان کی سیاسی زندگی میں برق رفتار تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں اور ایک حساس شاعر کا ہنگامی واقعات سے بے نیاز رہنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ شاید اس بھی اکبر الٰہ آبادی نے بعض معاملات پر اپنے مخصوص انداز میں اظہار خیال کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس روشِ خاص سے انھیں کوئی طبعی مناسبت نہیں تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے سیاسی میدان میں جولانیاں دکھانے کی بجائے اسے اپنے معاصر شبلی نعمانی اور آنے والے دور میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم کی تگ و تاز کے لیے چھوڑ دیا۔ پس ہنگامی واقعات اور اکابر کے طرز عمل پر طنز کی اس روش کو مولانا شبلی اور ان کے بعد مولانا ظفر علی خاں نے ہی پروان چڑھایا اور ہنگامی معاملات پر طنزیہ لہجے میں اظہار خیال کرتے رہے۔ مگر یہ روش چونکہ ادبی طنز و مزاح کے سلسلے میں ہی ممکن ہے۔

لیکن بہت سارے موقع ایسے بھی آئے کہ علامہ شبلی اور ظفر علی خاں نے معاشرے کے بعض دوسرے مسائل کو بھی ہدفِ طنز بنایا۔ لہٰذا اُردو شاعری میں طنز و مزاح کے ضمن میں بھی ان شعراء کا تذکرہ ضروری ہے۔

1.4 : خلاصہ

اکبرؔ کی شاعری کو عام طور پر بذلہ سنجی یا وٹ کی شاعری کہا گیا ہے اور یہ اس لیے کہ بیشتر موقعوں پر انھوں نے تخیّل اور معنی آفرینی کی بجائے صرف لفظی شعبدہ بازیوں سے مزاح پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ اکبرؔ کی شاعری میں خالص بذلہ سنجی کے ایسے اشعار بہت زیادہ ہیں۔ اسی لئے بعض حلقوں نے اکبرؔ کی شاعری کو بذلہ سنجی قرار دے کر اسے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں ایک پست مقام دلانے کی سعی کی ہے۔ لیکن ہم ان کے کلام کے اس بہت بڑے حصّے کو کیسے نظر انداز کریں جس میں اسلوب کی بہ نسبت خیال اور مواد پر زیادہ توجہ صرف ہوئی۔

اکبرؔ اِلٰہ آبادی کے طنز کے بارے میں ایک قابل غور نکتہ یہ ہے کہ کہیں کہیں اس کے پسِ پشت مجروح شخصیت اور احساس کمتری کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ غالباً اس کی وجہ ان کی زندگی کا نفسیاتی مطالعہ کرنے پر بے نقاب ہوسکتی ہیں اور یہ کام ماہرین نفسیات کا ہے۔ اکبرؔ اِلٰہ آبادی کے اس مخصوص طنزیہ طریقِ کار کے پس پشت جو جذبہ کارفرما تھا وہ درست اور حق بجانب تھا یا نہیں۔ اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے لیکن یہ بات یقیناً کہی جاسکتی ہے کہ ان کے طنز نے تعمیری کام سرانجام دیا۔ وہ اس طرح کہ اگرچہ ان کے لئے مغربی تہذیب کے سیلاب کو روکنا ممکن نہیں تھا اور نہ اس سیلاب کا رک جانا ہی ہماری ترقی کے لئے سودمند تھا۔

1.5 : فرہنگ

الفاظ	:	معنی
لسان	:	زبان
ربع	:	چار
شگاف	:	سوراخ
مضحک	:	ہنسانے والا
تضمین	:	ملانا۔ اصطلاح شاعری میں دوسرے کے شعر مصرع یا بند لگانا۔
تصرف	:	دخل دینا۔ قبضہ کرنا

بذلہ سنجی : خوش طبع، لطیفہ گو، ہنس مکھ

ہدف : نشانہ

1.6 : خود جانچنے کے سوالات :

سوال نمبر ا :(الف) : ایک جملے میں جواب دیجئے۔

(۱) اکبرالہ آبادی کی اکثر شاعری کس قسم کی ہے؟

(۲) اکبرالہ آبادی نے اپنی شاعری میں کس تہذیب کو طنز کا نشانہ بنایا ہے؟

(۳) اکبرالہ آبادی کی نظر میں سرسید احمد خاں کس فکر و خیال کو پروان چڑھا رہے تھے؟

(۴) بذلہ سنجی کے لئے سب سے پہلی شرط کیا ہے؟

(۵) اکبرالہ آبادی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے عروج کا زمانہ کیا تھا؟

(ب) صحیح ہے غلط، نشاندہی کیجئے۔

(۱) اکبرالہ آبادی کے طنز نے تعمیری کام انجام دیا۔ [ ]

(۲) اکبرالہ آبادی کی شاعری میں مغربی تہذیب کی مخالفت کے عناصر ملتے ہیں۔ [ ]

(۳) اکبرالہ آبادی سرسید کے ہم خیال شاعر تھے۔ [ ]

(۴) اکبرالہ آبادی کے طنز و مزاح کی وجہ ہندوستان میں مغربی تہذیب کے اثرات کم پڑے۔ [ ]

(۵) شبلی اور ظفر علی خاں دونوں نے اکبرالہ آبادی کے سلسلہ طنز کو آگے بڑھایا ۔ [ ]

(ج) مناسب اور صحیح جوڑیاں لگایئے۔

نمبر شمار	ستون الف	ستون ب
۱)	اکبرالہ آبادی	طنز کی روایت کو آگے بڑھانے والے
۲)	شبلی و ظفر علی خاں	بذلہ سنجی کی شاعری
۳)	سرسید احمد خاں	مغربی تہذیب کے حامی

سوال نمبر۲ : (الف) : مختصر جواب دیجئے۔

(۱) اکبر الہ آبادی کی ادبی خدمات پر سیر حاصل تبصرہ کیجئے ؟

(۲) اکبر الہ آبادی کی شاعری میں طنز و مزاح پر روشنی ڈالئے ؟

۳) اکبر الہ آبادی کی شاعری مغربی تہذیب کے مخالف شاعری تھی۔ بحث کیجئے ؟

(ب) : مفصل جواب تحریر کیجئے۔

(۱) اکبر الہ آبادی کی ادبی خدمات پر سیر حاصل تبصرہ کیجئے ؟

(۲) اکبر الہ آبادی کی شاعری میں طنز و مزاح پر روشنی ڈالئے ؟

(۳) اکبر الہ آبادی میں شاعری میں بذلہ سنجی کا عنصر زیادہ ملتا ہے۔ واضح کیجئے ؟

(۴) اکبر الہ آبادی کی شاعری مغربی تہذیب کے خلاف مشرقی تہذیب کی للکار سے تھی، واضح کیجئے ؟

(۵) اکبر الہ آبادی کی شاعری مغربی تہذیب کے مخالف شاعری تھی۔ بحث کیجئے ؟

1.7

حوالہ جاتی کتب :

اُردو ادب میں طنز و مزاح	از	وزیر آغا
اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	از	خلیل الرحمٰن
ترقی پسند ادبی تحریک	از	سردار جعفری
ترقی پسند ادبی تحریک کا پچاس سالہ سفر	از	ڈاکٹر قمر رئیس
ترقی پسند تحریک کی نصف صدی	از	سردار جعفری
جدیدیت کا فلسفیانہ اثر	از	ڈاکٹر شمیم حنفی
جدیدیت آج اور کل	از	شمس الرحمٰن فاروقی
جدیدیت ایک ہمہ جہت پہلو : محاسبہ	از	نریش ندیم

باب نمبر : 2

ترقی پسند اردو شاعر

اکائی کے اجزاء :

2.1 مقاصد
2.2 تمہید
2.3 ترقی پسند تحریک کا پس منظر
2.4 ترقی پسند تحریک کا آغاز وارتقاء
2.5 ترقی پسند اُردو شعراء
2.5.1 i) جوش ملیح آبادی
2.5.2 ii) فیض احمد فیض
2.5.3 iii) مخدوم محی الدین
2.5.4 iv) کیفی اعظمی
2.6 خلاصہ
2.7 مشقی سوالات
2.8 فرہنگ
2.9 حوالہ جاتی کتب

2.1 : مقاصد

☆ طلبہ ترقی پسند تحریک کے پس منظر سے واقف ہوں گے۔

☆ طلبہ ترقی پسند تحریک کے آغاز وارتقاء سے واقف ہوں گے۔

☆ طلبہ کی ترقی پسند شعراء اور انکی ادبی خدمات سے واقف ہوں گے۔

2.2 : تمہید

ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعر اور ادیب کسی نہ کسی حد تک کارل مارکس کے جزیاتی نظریے اور اس کے اقتصادی نظام سے متاثر تھے۔ متعدد مارکسی دانشور بالآخر ادب میں ترقی پسند کو اشتراکیت کی منزل سے مربوط کر دیتے ہیں۔ اس نظریہ نے ادب کے جانبدارانہ تصور پر زور دیا۔ مئی ۱۹۵۶ء میں حیدرآباد میں ''کل ہند اردو مجلس'' منعقد ہوئی جس میں ترقی پسند ادیب اور شاعر بھی اکٹھا ہوئے اور وہاں بھی یہی بحث رہی کہ اس کی ضرورت ہے یا نہیں۔ سجاد ظہیر کا خیال تھا کہ اب اس تنظیم کی ضرورت نہیں رہی۔ چونکہ خود ترقی پسندوں میں انتشار پیدا ہو چکا تھا۔ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ جدیدیت کی بحثیں شروع ہوگئی تھیں۔

۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۶۰ء کی ربع صدی میں ترقی پسند تحریک اردو کی اصناف سخن میں جو قابل قدر اضافے کیے اور اردو شعراء و ادب کو وسعت اور ہمہ گیری بخش کر جو ذخیرہ فراہم کیا اس سے انکار کرنا ایک طرح سے ناانصافی ہی ہوگی۔ ذیل میں اردو ادب میں ترقی پسندی کے قابل قدر حصے اور رول کے بارے میں جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

2.3 : ترقی پسند تحریک کا پس منظر

ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ آغاز سے قطع نظر اگر ہم غور کریں تو محسوس ہوگا کہ اس تحریک کا خمیر بہت پہلے سے تیار ہو رہا تھا۔ لندن میں ہندوستان کے کافی طلبہ تعلیم کی غرض سے مقیم تھے۔ ان طلبہ کا گرچہ ہندوستان کے مختلف خطوں سے تعلق تھا اور ان کی مادری زبانیں بھی مختلف تھیں لیکن نظریاتی طور پر ان میں ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ ہندوستان میں غریبوں اور مجبوروں پر ہونے والے مظالم کی خبریں ان تک پہنچی رہتی تھیں اور ان میں

برطانوی حکومت اور سرمایہ دار طبقہ کے خلاف غم و غصہ بڑھتا جاتا تھا۔ لہذا ہندوستانی نوجوانوں مثلاً سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جیوتی گھوش، محمد دین تاثیر اور پرمود سین گپتا وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں نے ''انڈین پروگریسیو رائٹرس اسوسی ایشن'' قائم کی۔ پھر اس کا اعلان نامہ تیار کیا گیا۔

جس میں کہا گیا کہ ''ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے نئے ادب کو ہماری موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہئے اور وہ ہے ہماری 'روٹی کا'۔ 'بدحالی کا'۔ 'ہماری سماجی پستی' کا اور 'سیاسی غلامی' کا سوال''۔

(یعقوب یاور: ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری ص۔ 55-56)

اس کے علاوہ اسی اسوسی ایشن نے ایسی تجاویز بھی پیش کیں جن کی بنیاد پر ادیبوں کو اور اس اسوسی ایشن کو آگے کی کاروائی کرنی تھی مثلاً ہندوستان کے مختلف لسانی صوبوں میں ادیبوں کی انجمنیں قائم کرنا۔ ان انجمنوں کے درمیان اجتماعوں اور مجلسوں وغیرہ کے ذریعے رابطہ و تعاون پیدا کرنا۔ صوبوں کی مرکز اور لندن کی انجمنوں کے درمیان تعلق پیدا کرنا۔ ترقی پسند ادب کی تخلیق اور اس کا ترجمہ کرنا جو صحتمند اور توانا ہو۔ جس سے ہم تہذیبی پسماندگی کو مٹا سکیں اور ہندوستانی مزید سماجی ترقی کی طرف بڑھ سکیں وغیرہ۔ اس گروپ نے اپنی پہلی باقاعدہ میٹنگ لندن کے ایک چینی ریستوران ''نان کنگ ریستوران'' میں کی جس میں ملک راج آنند کو صدر منتخب کیا گیا۔

یہ لوگ پیرس میں منعقدہ World congress of the writers for the defance culture سے بھی کافی متاثر ہوئے۔ اس کانفرنس میں میکسم گورکی، ویلڈو فرینک، آندرے مارلو، برتول بریخت، ای ایم فاسٹر، لوئی آراگان، بورس پاسترنج اور رومین رواں جیسے ممتاز ادیبوں نے شرکت کی تھی۔ اور انھوں نے جو تجاویز منظور کی تھیں ان میں انسانیت کی بالادستی اور مظالم کی سرکوبی کے عزائم کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ پوری دنیا کے ادیبوں کو متحد کرنے کی یہ ایک بہت بڑی اور کامیاب کوشش تھی۔

اس کانگریس سے انڈین پروگریسیو رائٹرس اسوسی ایشن کے ارکان کو اپنے مقاصد کو تیزی سے عملی جامہ پہنانے کی ترغیب ملی اور انھوں نے اپنی کوشش لندن کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی شروع کر دی اس ضمن میں سب سے پہلے تو انھوں نے اہم ارکان کے دستخطوں کے ساتھ ''اعلان نامہ'' کو ہندوستان کے اہم ادیبوں تک پہنچایا۔ پریم چند نے اس کی زبردست حمایت کرتے ہوئے اسے اپنے رسالے ''ہنس'' میں شائع کر دیا۔ مجموعی طور پر پورے ملک میں اس اعلان نامہ کا خیر مقدم کیا گیا۔

۱۹۳۵ء کے آخر میں سجاد ظہیر ہندوستان واپس آ گئے ۔ انھوں نے مختلف علاقوں اور مختلف زبانوں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں سے رابطہ قائم کیا ۔لیکن اس سے پہلے افسانوں کے مجموعے ''انگارے'' کے افسانوں نے ہندوستان کے سیاسی اور سماجی ماحول کو کافی گرم کر دیا تھا۔جس کے مصنفین میں سجاد ظہیر۔احمد علی۔محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں شامل تھے۔ان میں سے موخر الذکر تین ادیبوں نے ہندوستان میں ترقی پسند نظریات کی تبلیغ سجاد ظہیر کی آمد سے پہلے ہی شروع کر دی تھی۔اندرون ہندوستان اور لندن میں کی گئی تمام جدوجہد کا نقطۂ عروج اپریل ۱۹۳۶ء میں الہ آباد میں منعقدہ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کی صورت میں سامنے آیا۔

2.4 : ترقی پسند تحریک کا آغاز وارتقاء

ترقی پسند تحریک کا با قاعدہ آغاز اپریل ۱۹۳۶ء کی اس کانفرنس سے ہوتا ہے جس کی صدارت پریم چند نے کی تھی۔ پریم چند نے اپنے صدارتی خطبے میں ادب کی غرض و غایت بیان کی ۔ادیبوں کو ادبی ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور اس جلسے کو ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ قرار دیا۔اس خطبے میں انھوں نے کہا کہ :

''ہم اپنے آپ کو ہندوستانی تہذیب کی بہترین روایات کا وارث سمجھتے ہیں اور روایات کو اپناتے ہوئے ہم اپنے ملک میں ہر طرح کی رجعت پسندی کے خلاف جدو جہد کریں گے اور ہر ایسے جذبے کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہترین زندگی کی راہ دکھائے۔''

انھوں نے ادیبوں اور فنکاروں کے لیے حسن و جمال کی بدلتی ہوئی معنویت بدلتے ہوئے حالات اور عصری حیثیت کے تناظر میں ادب کی تعریف بھی پیش کی ہے۔اس کانفرنس میں شرکت کرنے والوں میں پریم چند کے علاوہ چودھری محمد علی ردولوی، سید سجاد ظہیر، احمد علی، فراق گورکھپوری، محمود الظفر ،حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی جیسے شعراء وادباء کے علاوہ ریاست بنگال، مہاراشٹر، گجرات، اور مدراس وغیرہ کے نمائندے شامل تھے۔اسی کانفرنس میں سجاد ظہیر کو انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سیکریڑی منتخب کیا گیا۔

اس کانفرنس کی خاطر خواہ کامیابی کے بعد مختلف شہروں میں انجمن کی کانفرنسیں منعقد ہوئیں اور اس کی شاخوں کا قیام عمل میں آیا۔ دہلی، ممبئی، کلکتہ، بھیمڑی (موجودہ بھیونڈی کا قدیم نام)، حیدر آباد، الہٰ آباد، لکھنؤ،

رانچی اور جے پور وغیرہ میں بتدریج کانفرنسیں اور سیمینار ہوتے رہے۔ بے شمار شاعر و ادیب اس تحریک سے وابستہ ہوئے اور اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے بے لوث خدمات انجام دیں۔ جس کے سبب اس تحریک نے تنظیمی و علمی سطح پر ارتقائی منازل طے کیں اور بیسویں صدی کی سب سے کامیاب ادبی تحریک بن گئی۔ لیکن جس طرح دن کے بعد رات اور شام کے بعد صبح کا ہونا فطری عمل ہے اسی طرح عروج کے بعد زوال بھی لازمی ہے۔ اس تحریک کا نہ صرف آغاز ہوا بلکہ اسے زبردست عروج بھی حاصل ہوا۔ اس تحریک نے نسلوں کو متاثر کیا۔ ادب کی فضاء پر آسمان کی طرح سایہ فگن ہوگئی اور پھر رفتہ رفتہ تحلیل ہوگئی۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد جو تحریکیں اور ادارے تعطل اور انتشار کے شکار ہوئے ان میں ترقی پسند تحریک کا نام بھی کافی اہم ہے۔ اس تحریک کے روح رواں سید سجاد ظہیر ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ بعض ادیب و شاعر باحیات نہیں رہے اور اسی طرح بیسیویں صدی کے چھٹے دہے میں ہی نظریاتی اعتبار سے اس تحریک میں بکھراؤ کے آثار نظر آنے لگے۔ ۱۹۴۸ء کے بعد رندوے کی قیادت میں کمیونسٹ پارٹی جس دار و گیر کا شکار ہوئی اس کی وجہ سے بہت سے ادیب انجمن ترقی پسند مصنفین سے الگ ہوگئے۔

آزادی کے بعد خود ترقی پسند مصنفین نے ایک قرارداد کے ذریعے غیر کمیونسٹ ادیبوں پر انجمن کے دروازے بند کر دیئے۔ انجمن اور تحریک کو نقصان پہنچانے میں اس واقعہ نے سب سے اہم رول ادا کیا اس تحریک کو پروپگنڈہ اور نعرے کا نام بھی دیا گیا۔

بعض ادیبوں اور شاعروں نے جب یہ محسوس کیا کہ یہ تحریک پروپگنڈہ بن گئی ہے اور اس سے ادب مجروح ہو رہا ہے تو انہوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس طرح آٹھویں دہائی کے آتے آتے ترقی پسند تحریک تحلیل ہو چکی تھی اور ترقی پسند تحریک کے ہی بطن سے ایک دوسری 'جدیدیت' کے نام سے پوری طرح سے سر ابھار چکی تھی۔

2.5 : ترقی پسند اُردو شعراء

ترقی پسند تحریک سے بڑے بڑے شعراء اور ادباء وابستہ ہو چلے تھے اور انھوں نے اپنی شاعری اور ادب میں ترقی پسند خیالات و نظریات کی ترجمانی بھرپور انداز سے پیش کرنا شروع کر دی تھی۔

اس تحریک سے وابستہ شعراء میں شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین اور کیفی اعظمی جیسے سربرآوردہ شعراء شامل تھے۔ ان شعراء کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور ان کی شاعری پر اس تحریک کے اثرات کے بارے میں تفصیل درج ذیل ہے :

2.5.1 : جوش ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھے۔ حسن پرستی، خود پرستی، عنایت اور سیمابیت جیسی جاگیردارانہ نظام کی خصوصیات انھیں ورثے میں ملی تھیں۔ جوش کو 'شاعر انقلاب' بھی کہا جاتا ہے۔

جوش کو انقلابی نظمیں لکھنے پر کچھ تو ملکی و عالمی ماحول نے اکسایا تو اقبال کی انقلابی نظموں نے ان کی رہنمائی کی لیکن چونکہ ان کے یہاں فکر و فلسفیانہ بصیرت کی کمی ہے اس لیے ان کے یہاں انقلاب کا کوئی واضح اور صحیح تصور نہیں ملتا اور وہ انقلاب کی روح تک پہنچنے میں ناکام رہتے ہیں۔ ان کا تصورِ انقلاب حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے ہر طاقت سے ٹکرانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ اس کے لئے کشت و خون سے بھی گریز نہیں کرتے لیکن چونکہ ان کے یہاں اقبالؔ جیسی بصیرت نہیں ہے اس لئے وہ کسی نئی تعمیر کا تصور نہیں پیش کرتے اور وہ تبدیلی یا تخریب ہی کو انقلاب سمجھ بیٹھتے ہیں، اس طرح جوشؔ کی انقلابی شاعری کو باغیانہ شاعری کا نام دینا مناسب ہوگا۔

جوشؔ کی بعض نظمیں طنزیہ شاعری کی بہترین مثال ہیں۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی جو، جوشؔ کی شاعری کو توجہ کے لائق نہیں سمجھتے، انھوں نے بھی جوشؔ کی طنزیہ شاعری کو پسند کیا ہے۔ یہ نظمیں جوشؔ نے اپنے گرد و پیش میں پائے جانے والے عدم توازن، ستم ظریفی، حالات یا زندگی کی حقیقت کی بے حرمتی کے ردعمل کے طور پر کہی ہیں۔

جوشؔ کی شاعری کا ایک پہلو جو ہمیں خاص طور سے متاثر کرتا ہے وہ ان کی منظر نگاری ہے۔ جوشؔ فطرت کے پرستار ہیں، انہوں نے فطرت کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا اور انھیں برتا۔ ان کی منظر نگاری میں ہمیں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ فطرت کے بکھرے ہوئے حسن کو اپنی آنکھوں کے راستے سے اپنی روح میں جذب کر لیتے ہیں پھر وہ اپنی نظموں کے ذریعہ اپنے پڑھنے والوں کو بھی حسن فطرت سے لطف اندوز ہونے میں شریک کرتے ہیں۔

جوش کی نظموں میں 'برسات کی شفق'۔ 'ربودگی'۔ 'جادو کی سرزمین'۔ 'فتنہ خانقاہ'۔ 'جھریاں'۔ 'نا آشنا مہمان'۔ 'برسات کی شام'۔ 'جوانی کی آمد آمد'۔ 'آوازوں کی سیڑھیاں'۔ 'فاختہ کی آواز' اور 'البیلی صبح' وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

2.5.2 : فیض احمد فیضؔ

فیض احمد فیضؔ کا شمار بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعراء میں وہ صفِ اوّل کے شاعر مانے جاتے ہیں۔ وہ نہ صرف بہترین نظم گو شاعر ہیں بلکہ انھوں نے غزل کو بھی ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے غزل کی روایتی علامتوں کے پردے میں 'حکمرانوں کے جو ظلم و ستم۔ لیلائے وطن سے محبت۔ آزادِ وطن کی سازشوں اور اپنی بے گناہی کا ذکر نہایت خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ زبان کا گداز، لہجے کی شیرینی اور جذبے کی دھیمی آنچ نے اُن کی شاعری کو دلکشی اور مقبولیت عطا کر دی ہے۔ مظلوم و محروم لوگوں کے حقوق کی بازیابی اور ظلم و ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔

'نقشِ فریادی'۔ 'دستِ صبا'۔ 'زنداں نامہ'۔ 'دستِ تہہ سنگ'۔ 'سرِ وادیٔ سینا'۔ 'شامِ شہرِ یاراں'۔ اُن کے مشہور شعری مجموعے ہیں۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'میزان'۔ 'صلیبیں میرے دریچے میں' (بیوی کے نام لکھے گئے خطوط کا مجموعہ) ان کا ادبی سرمایہ ہیں۔ فیض احمد فیضؔ نے دیگر ادیبوں کی طرح آزادی کی جدوجہد کے لیے قلم کا سہارا لیا۔ اس کے عوض انھیں قید و بند کی مشکلیں بھی اٹھانی پڑیں۔ دستِ صبا اور دستِ تہہ سنگ ان کے دورِ اسیری کی یادگار ہیں۔ انھیں کئی اعزازات اور ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کا انتقال ۱۹۸۴ء میں ہوا۔

''نثار میں تیری گلیوں پر'' یہ نظم ان ہی میں سے ایک ہے۔ یہ پوری نظم غزلیہ لب و لہجہ میں ہے۔ شاعر نے وطن کو محبوب کے انداز میں پیش کیا ہے۔ غمِ دوراں کو غمِ جاناں میں ڈھال کر پیش کرنے کی یہ نظم بہترین مثال ہے۔ اس نظم کے ہر بند سے فیض احمد فیضؔ کی اپنے وطن سے بے پناہ محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس نظم کے مطالعے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شاعر کا وطن ایک قید خانے میں تبدیل ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ خود شاعر ہی اسیر زنداں ہے۔ بے

وفاؤں اور غداروں کی حکومت ہے۔ ملک سے محبت رکھنے والے اور وفادار لوگ سر جھکا کر چلنے پر مجبور ہیں۔ وطن کے جیالوں کا مقدر قید و بند کے سوا کچھ اور نہیں۔ اہلِ ہوس، وکیل اور منصف ہیں۔ ایسے میں بھلا انصاف کی امید کیوں کر اور کیسے کی جاسکتی ہے ؟

لیکن ان حالات میں بھی شاعر مایوس نہیں۔ ازل سے ہی حق و باطل کے درمیان کشمکش ہمیشہ جاری رہی ہے۔ ظالم و جابر اپنی روش سے باز آنے والے نہیں۔ دوسری طرف محبانِ وطن راہِ وفا سے ہٹنے کو تیار نہیں۔ شاعر کو یقین ہے کہ فتح بہر حال وطن کے جاں نثار کی ہی ہوگی۔ وہ کہتا ہے کہ اگر آج حالات ہمارے لئے سازگار نہیں تو گھبرانے کی بات نہیں۔ جلد ہی کامیابی ہمارے قدم چومے گی اور ظالم و جابر طاقتوں کو پسپا ہونا پڑے گا۔

2.5.3 : مخدوم محی الدین

مخدوم محی الدین نے عشقیہ اور رومانی اور انقلابی نظمیں لکھیں۔ مخدوم محی الدین کی بیشتر نظموں میں جمالیاتی کیف اور سرشاری کا انداز ملتا ہے۔ ان میں تازگی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک انقلابی مجاہد ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی بیشتر نظموں کو خشکی اور کرختگی سے بچالیا ہے۔

ممتاز حسین نے اپنے ایک مضمون میں کہا ہے کہ تغزل کے عناصر کی وجہ سے مخدوم محی الدین کی نظمیں ادبی فن پارہ کا خوبصورت نمونہ بن جاتی ہیں ۔ جب کہ ان ہی موضوعات پر سردار جعفری کی آواز خطابت کا روپ دھار لیتی ہے۔

'طور'۔ 'سجدہ'۔ ' انتظار'۔ 'محبت کی چھاؤں'۔ 'نامہ حبیب'۔ 'وہ'۔ 'نو رس' اور' پشیمانی' وغیرہ مخدوم کی خوبصورت اور رومانی نظمیں ہیں۔ ان کی انقلابی نظموں مثلاً 'انقلاب'۔ ' آتش کدہ قمر'۔ 'سپاہی اور اسٹالن' اور انکی آخری نظم ''چارہ گر'' میں تو غزلیہ عناصر کی موجودگی خوبصورت فن پارہ بنا دیتی ہے۔ بقول عزیز احمد ''خالص شاعرانہ حیثیت سے بھی اسکے کھرے ہونے میں کلام نہیں۔''

مخدوم محی الدین کا مجموعۂ کلام ''سرخ سویرا'' اور ''بساطِ رقص'' اس کا ثبوت ہیں۔ علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک میں یوں تو ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے لیکن جلد ہی وہ شاعری کی طرف مائل ہو گئے اور شعر و شاعری کے میدان میں اپنا ممتاز مقام بنالیا۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ''پرواز'' تھا۔ جس میں ''سرمایہ دار لڑکیاں''

اور ''دیہاتی لڑکیاں'' جیسی نظمیں تھیں۔ان کی نظموں کے عمومی موضوعات اخباری خبروں ،بیانات اور اداریوں سے متاثر ہیں۔اسی لئے ان کے یہاں کرختگی اور خطابت کا انداز نمایاں ہے۔سردار جعفری اقبال سے بھی متاثر ہیں۔

2.5.4 : کیفی اعظمی

کیفی اعظمی بھی مشہور ترقی پسند شاعر ہیں۔ان کے یہاں بھی خطابت جھلکتی ہے۔لیکن سردار جعفری کے مقابلے میں کم ہے۔'اندیشہ'۔'پشیمانی'۔'ٹرنک کال'۔'پامسٹ'۔'حوصلہ' اور 'تبسّم' وغیرہ اُن کی اچھی نظمیں شمار کی جاتی ہیں۔

ان کے یہاں بھی وقتی اور عارضی موضوعات ملتے ہیں۔مثلاً 'گاندھی'۔'جناح کی ملاقات پر'۔'سوویت یونین اور ہندوستان'۔'فتح برلن' اور 'سوئے برلن جارہی ہے سرخ فوج'۔'قومی حکمراں'۔'ریاستِ ٹراونکور کے مجاہدوں کا ترانہ' اور 'الیکشن کے دنوں میں مولانا آزاد اور خضرِ حیات کی ملاقات' وغیرہ۔کیفی نے شبلی اور اقبال کے تتبع کی بھی کوشش کی۔

اس طرح کی نظموں میں ''مژدہ'' اور ''سپردگی'' شامل ہیں۔ان کے علاوہ ''کوریا کا نعرہ'' اور ''امین'' وغیرہ نظمیں بھی ہیں۔جس سے وہ ترقی پسند شاعروں میں ممتاز رہے ہیں۔''جھنکار'' اور ''آخرِ شب'' ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

2.6 : خلاصہ

ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ آغاز سے قطع نظر اگر ہم غور کریں تو محسوس ہوگا کہ اس تحریک کا خمیر بہت پہلے سے تیار ہو رہا تھا۔لندن میں ہندوستان کے کافی طلبہ تعلیم کی غرض سے مقیم تھے۔ان طلبہ کا اگرچہ ہندوستان کے مختلف خطوں سے تعلق تھا اور ان کی مادری زبانیں بھی مختلف تھیں لیکن نظریاتی طور پر ان میں ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔گورکی، ویلڈو فرینک، آندرے مارلو، برتول بریخت، ای ایم فاسٹر، لوئی آراگان، بورس پاسترنج اور رومین رواں جیسے ممتاز ادیبوں نے شرکت کی تھی۔۱۹۳۵ء کے آخر میں سجاد ظہیر ہندوستان واپس آگئے۔انھوں نے

مختلف علاقوں اور مختلف زبانوں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں سے رابطہ قائم کیا اس سے پہلے ''انگارے'' کے افسانوں نے ماحول کو کافی گرم کر دیا تھا۔ جس کے مصنفین میں سجاد ظہیر، احمد علی، محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں شامل تھے۔

ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز اپریل ۱۹۳۶ء کی اس کانفرس سے ہوتا ہے جس کی صدارت پریم چند نے کی تھی۔ پریم چند نے اپنے صدارتی خطبے میں ادب کی غرض و غایت بیان کی۔ ادیبوں کو ادبی ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور اس جلسے کو ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ قرار دیا۔ اس کانفرنس میں شرکت کرنے والوں میں پریم چند کے علاوہ چودھری محمد علی ردولوی، سید سجاد ظہیر، احمد علی، فراغ گورکھپوری، محمود الظفر، حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی کے علاوہ بنگال، مہاراشٹر، گجرات، اور مدراس وغیرہ کے نمائندے شامل تھے۔ اسی کانفرنس میں سجاد ظہیر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکریڑی منتخب کئے گئے۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد جو تحریکیں اور ادارے تعطل اور انتشار کا شکار ہوئے ان میں ترقی پسند تحریک بھی کافی اہم ہے۔ اس تحریک کے روح رواں سید سجاد ظہیر ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ بہت سارے ادیب و شاعر نہیں رہے اور اسی طرح چھٹے دہے میں ہی نظریاتی اعتبار سے اس تحریک میں بکھراؤ کے آثار نظر آنے لگے۔

جوش کو 'شاعر انقلاب' کہا جاتا ہے۔ جوش کا انقلابی نظمیں لکھنے پر کچھ تو ملکی و عالمی ماحول نے اکسایا اور کچھ اقبال کی انقلابی نظموں نے ان کی رہنمائی کی لیکن چونکہ ان کے یہاں فکر و فلسفیانہ بصیرت کی کمی ہے اس لیے ان کے یہاں انقلاب کا کوئی واضح اور صحیح تصور نہیں ملتا اور وہ انقلاب کی روح تک پہنچنے میں ناکام رہتے ہیں۔ جوشؔ کی انقلابی شاعری کو باغیانہ شاعری کا نام دینا مناسب ہوگا۔ جوشؔ کی بعض نظمیں طنزیہ شاعری کی بہترین مثال ہیں۔

جوشؔ کی شاعری کا ایک پہلو جو ہمیں خاص طور سے متاثر کرتا ہے وہ ان کی منظر نگاری ہے۔ جوشؔ فطرت کے پرستار ہیں، انہوں نے فطرت کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا اور انھیں برتا ہے۔ ان کی منظر نگاری میں ہمیں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کی نظموں میں برسات کی شفق، ربودگی، جادو کی سرزمین، فتنہ خانقاہ، جھریاں، نا آشنا مہمان، برسات کی شام، جوانی کی آمد آمد، آوازوں کی سیڑھیاں، فاختہ کی آواز اور البیلی صبح وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

ترقی پسند شعراء میں فیض احمد فیضؔ صفِ اوّل کے شاعر مانے جاتے ہیں۔ وہ نہ صرف بہترین نظم گو شاعر ہیں بلکہ انھوں نے غزل کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے غزل کی روایتی علامتوں کے پردے میں حکمرانوں کے جو ظلم و ستم 'لیلائے وطن سے محبت' آزادوطن کی سازشوں اور اپنی بے گناہی کا ذکر نہایت خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ زبان کا گداز، لہجے کی شیرینی اور جذبے کی دھیمی آنچ نے اُن کی شاعری کو دلکشی اور مقبولیت بخشی ہے، مظلوم و محروم لوگوں کے حقوق کی بازیابی اور ظلم و ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ 'نقشِ فریادی' 'دستِ صبا' 'زندان نامہ' 'دستِ تہہ سنگ' 'سرِ وادی سینا' شامِ شہر یاراں ان کے مشہور شعری مجموعے ہیں۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'میزان' صلیبیں میرے دریچے میں (بیوی کے نام لکھے خطوط کا مجموعہ) ان کا ادبی سرمایہ ہیں۔

مخدوم محی الدین کی بیشتر نظموں میں جمالیاتی کیف اور سرشاری کا انداز ملتا ہے۔ ان میں تازگی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک انقلابی مجاہد ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی بیشتر نظموں کو خشکی اور کرختگی سے بچالیا ہے۔ ان کی نظمیں طور، سجدہ، انتظار، محبت کی چھاؤں، نامہ حبیب، وہ، نورس اور پیشمانی، خوبصورت رومانی نظمیں ہیں۔ ان کی انقلابی نظموں مثلاً انقلاب، آتش کدہ قمر اور سپاہی اور اسٹالن اور آخری نظم ''چارہ گر'' میں تو غزلیہ عناصر کی موجودگی اسے خوبصورت فن پارہ بنادیتی ہے۔

کیفی اعظمی بھی مشہور ترقی پسند شاعر ہیں۔ ان کے یہاں بھی خطابت جھلکتی ہے۔ اس طرح کی نظموں میں ''مژدہ'' اور ''سپردگی'' شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کوریا کا نعرہ اور ''امین'' وغیرہ نظمیں بھی ہیں۔ جس سے وہ ترقی پسند شاعروں میں ممتاز رہے ہیں۔ ''جھنکار'' اور ''آخر شب'' ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

2.7 : فرہنگ

الفاظ : معنی

خمیر : مزاج

منظّم : وہ چیز جو انتظام کے ساتھ ہو۔

اشتراکیت : ایک اعتدال پسند نظریہ حیات جس کے مطابق ذرائع

پیداوار پر عوام کی مشترکہ ملکیت ہونی چاہیے۔

تغزّل : غزل کے خمیر کو تغزل کہتے ہیں۔

امتزاج : ہم آہنگی

بگولہ : ہوا کا چکّر

مدعی : دعوا کرنے والا

زنداں : قید خانہ۔جیل

سلاسل : زنجیریں، بیڑیاں

سعی : کوشش

رودِ عمیق : گہرا دریا

2.8 : خود جانچنے کے سوالات

سوال نمبرا : (الف) : ایک جملے میں جواب دیجئے۔

(۱) ترقی پسند تحریک کا آغاز کب ہوا؟

(۲) ترقی پسند تحریک کا پہلا اجلاس کس کی صدارت میں منعقد کیا گیا تھا؟

(۳) 'لندن کی ایک رات' کس کا لکھا ہوا ناول ہے؟

(۴) شاعر انقلاب کسے کہا جاتا ہے؟

(۵) 'سوز وطن' کس کے افسانوں کا مجموعہ ہے؟

(ب) صحیح ہے غلط، نشاندہی کیجئے۔

(۱) ترقی پسند تحریک کی شروعات علی گڑھ سے ہوئی۔ [ ]

(۲) پریم چند نے ترقی پسند تحریک کے اجلاس میں تحریک کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ [ ]

(۳) سجاد ظہیر اور اسن کے دوستوں نے لندن میں ترقی پسند تحریک کا منصوبہ تیار کیا تھا۔

(۴) حسرت موہانی بھی ترقی پسند تحریک میں شامل تھے۔ [ ]

(۵) مخدوم محی الدین ترقی پسند تحریک کے خت مخالف شاعر تھے۔ [ ]

(ج) مناسب اور صحیح جوڑیاں لگایئے۔

نمبر شمار	ستون الف	ستون ب
۱)	سجاد ظہیر	۱۹۳۶
۲)	ترقی پسند تحریک کا پہلا اجلاس	لندن کی ایک رات
۳)	ترقی پسند تحریک کے اجلاس اول کے صدر	منشی پریم چند
۴)	منشی پریم چند	سوز وطن
۵)	فیض احمد فیض	نقش فریادی

سوال نمبر۲ :

(الف) : مختصر جواب دیجئے۔

(۱) ترقی پسند تحریک کے لئے کن لوگوں نے پہلی تجویز پیش کی تھی؟

(۲) ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے آغاز کا کیا سبب ہوا؟

۳) ترقی پسند تحریک سے وابستہ اہم شعراء کون کون سے تھے؟

(ب) : مفصل جواب تحریر کیجئے۔

(۱) ترقی پسند تحریک کے آغاز وارتقاء پر روشنی ڈالیے ؟

(۲) ترقی پسند تحریک کا پس منظر اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

(۳) جوشؔ ملیح آبادی کو انقلابی شاعر کہا جاتا ہے۔ واضح کیجیے۔

(۴) فیض احمد فیضؔ کی ادبی خدمات مفصّل تحریر کیجیے۔

(۵) مخدوم محی الدّین اور انکی نظم نگاری پر روشنی ڈالیے۔

2.9 : سفارش کردہ کتب

اُردو ادب میں طنز و مزاح از ڈاکٹر وزیر آغا

اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — از خلیل الرحمٰن

ترقی پسند ادبی تحریک — از سردار جعفری

ترقی پسند ادبی تحریک کا پچاس سالہ سفر — از ڈاکٹر قمر رئیس

ترقی پسند تحریک کی نصف صدی — از سردار جعفری

جدیدیت کا فلسفیانہ اثر — از ڈاکٹر شمیم حنفی

جدیدیت آج اور کل — از شمس الرحمٰن فاروقی

جدیدیت ایک ہمہ جہت پہلو : محاسبہ — از نریش ندیم

ترقی پسند تحریک اور اُردو شاعری — از یعقوب یاور

باب نمبر : 3

ترقی پسند اُردو نثر نگار

اکائی کے اجزاء :

3.1 مقاصد

3.2 تمہید

3.3 ترقی پسند اُردو نثر نگار

3.3.1 : منشی پریم چند

3.3.2 : علی عباس حسینی

3.3.3 : راجندر سنگھ بیدی

3.3.4 : عصمت چغتائی

3.4 خلاصہ

3.5 فرہنگ

3.6 مشقی سوالات

3.7 حوالہ جاتی کتب

3.1 : مقاصد :

☆ طلبہ ترقی پسند تحریک سے واقف ہوں گے۔
☆ طلبہ ترقی پسند تحریک کے اہم نثر نگار سے واقف ہوں گے۔
☆ طلبہ پریم چند کی ادبی خدمات سے واقف ہوں گے۔

3.2 : تمہید

ترقی پسند تحریک کی بنیاد یوں تو لندن میں رکھی گئی ۱۹۳۰ء میں لندن میں چند ہندوستانی طالب علموں نے اپنے ملک کے سیاسی وسماجی حالات کے تناظر میں انسانیت کی خدمت کا خواب دیکھا اور انفرادی طور پر سعی وجستجو کرنے کے بجائے اجتماعی طور پر تمام زبانوں کے تخلیق کاروں کو ہمراہ لیکر ایک تحریک شروع کرنے کا عزم کیا۔ اس تحریک کا باقاعدہ آغاز اپریل ۱۹۳۶ء میں الہ آباد میں منعقدہ اس کانفرنس سے ہوتا ہے جس کی صدارت شہرہ آفاق ادیب منشی پریم چند نے کی تھی۔ اُردو کے معروف ادیبوں اور شاعروں نے اس تحریک کی سرپرستی کی جن میں منشی پریم چند، مولوی عبدالحق، مولانا حسرت موہانی، جوشؔ ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، سیّد سجاد ظہیر، فیض احمد فیضؔ، ملک راج آنند، عزیز احمد وغیرہ شامل تھے۔ یہ تحریک اس دور میں اس حد تک اثر انداز ہوئی کہ پرانے اور تجربہ کار قلم کاروں کے ساتھ ساتھ ہر نیا فن کار چاہے وہ شاعر ہو یا ادیب۔ اس تحریک سے خود کو وابستہ کرنے میں فخر محسوس کرنے لگا۔

3.3 : ترقی پسند اُردو نثر نگار

ترقی پسند تحریک کے اثرات کی وجہ سے جہاں اپنے وقت کے مشہور شعراء اس تحریک کے نہ صرف زبردست حامی بن گئے تھے بلکہ اس کی ترویج وترقی میں پیش پیش بھی تھے۔ یہ تحریک اتنی زبردست تھی کہ اس زمانے کے نثر نگار بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے چنانچہ اپنے وقت کے بڑے بڑے نثر نگار مثلاً منشی پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، علی عباس حسینی اور عصمت چغتائی اس تحریک سے وابستہ ہو گئے اور اپنے قلم کا رخ اسی تحریک کی رو میں کر دیا۔ ترقی پسند تحریک سے متاثر اور وابستہ نثر نگاروں میں سے مشہور نثر نگاروں کی شخصیت اور فن کا ذکر

کیا جاتا ہے ۔

3.3.1 : منشی پریم چند

پریم چند کی ادبی شخصیت اور انکی ذہنی تشکیل میں گاندھی جی، ٹالسٹائی، ٹیگور اور سرت چٹر جی کی تعلیمات کا بڑا ہاتھ ہے۔ علاوہ ازیں طلسمِ ہوشربا نے انکی قوت فکر کو تیز اور فسانہ آزاد کے مطالعہ نے ان کے اندر عصری حسیت اور سماجی حقائق کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت پیدا کی۔ گاندھی جی، ٹیگور اور سرت چٹر جی کے اثرات نے پریم چند کے ذہن کو وسعت بخشی اور انھیں حب الوطنی اور انسانی ہمدردی کے جذبہ سے آشنا کیا۔ حالؔی کی ادبی تحریک نے پریم چند کو سادگی اور اخلاقی اقدار سے روشناس کرایا۔

پریم چند کی ادبی زندگی ۱۹۰۵ء سے ۱۹۳۶ء تک پھیلی ہوئی ہے۔ ابتدائی دور میں پریم چند راجپوت سورماؤں کے قصے سنا کے ماضی کی بازیافت کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وطنیت، قوم پرستی اور پریم بھگتی کو راہِ نجات قرار دیتے ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانے سوز وطن کے نام سے سامنے آئے۔ اس مجموعہ کی تمام کاپیاں انگریزی حکومت نے ضبط کر لی۔ سوز وطن کے بعد پریم چند کی ادبی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس کے افسانوں میں تاریخی اور اصلاحی رنگ نمایاں ہے۔ ان اصلاحی افسانوں میں 'بازیافت' 'حجِ اکبر' 'سوتیلی ماں' 'نجات' 'مندر' اور 'مستعار گھڑی' قابل ذکر ہیں۔ ان تمام افسانوں میں مقصدی رنگ نمایاں ہے۔

اسکے بعد ان کی ادبی زندگی کا آخری دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے افسانوں میں پریم چند اس مصلح کا لبادہ اتار کر ایک انقلابی افسانہ نگار کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں وہ آدرش واد کے طلسمی دائرے سے نجات حاصل کر کے اس حقیقت کے معترف نظر آتے ہیں کہ بغیر انقلابی عمل کے حالات میں تبدیلی ممکن نہیں۔

پریم چند کے افسانے زبان و بیان کی خوبیوں سے بھی مالا مال ہیں۔ ان کی زبان نہایت سلیس شگفتہ اور رواں ہے۔ فارسی اور ہندی دونوں کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ عبارت میں بیحد آمد اور زور ہے۔ حسبِ ضرورت تشبیہات و استعارات سے بھی کام لیتے ہیں۔ بعض افسانوں میں منظر نگاری کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ گرچہ ان کے طرز تحریر میں شاعرانہ لطافت اور رنگ آمیزی نہیں ہے لیکن انسانی زندگی اور نفسیات کے بارے میں حکیمانہ نکتے جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ مکالمہ نگاری میں پریم چند کا فن بہت نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ ہر طبقے کی

نفسیات اور اس کے لب ولہجہ اور زبان و بیان سے واقف ہیں۔ اور کرداروں کے مکالموں اور باتوں کو جوں کا توں اصلی شکل میں پیش کر دیتے ہیں۔ بے تکلفی اور فطری اندازِ بیان سے انکی تحریروں میں دلکشی کے ساتھ ساتھ بڑی زندگی اور توانائی پیدا ہوگئی ہے۔ سادہ و سلیس ہونے کے باوجود پریم چند کی تحریریں فکر انگیز نثر کا جادو جگانے میں کامیاب ہیں۔

3.3.2 : علی عباس حسینی

علی عباس حسینی نے ترقی پسند تحریک سے پہلے ''ایک ماں کے دو بچّے''۔ ''باسی پھول'' اور ''انسپکٹر کی عید'' جیسے افسانے لکھے تھے۔ ترقی پسندی سے متاثر ہوکر، ''آم کا پھل''۔ ''کیا کیا جائے'' اور ''بھوک'' جیسی کہانیاں لکھیں۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں کے مجموعے ''آئی سی۔ایس''۔ ''باسی پھول'' اور ''میلہ گھومتی'' ہیں۔

3.3.3 : راجندر سنگھ بیدیؔ

راجندر سنگھ بیدیؔ کا شمار اُردو افسانہ نگاروں کی صفِ اوّل میں ہوتا ہے۔ انکی اس ادبی عظمت کا راز ان کے فنی خلوص اور فنی بصیرت میں مضمر ہے۔ زندگی کے گہرے مشاہدے اور انسانی فطرت و نفسیات کے عمیق مطالعہ نے ان کی کہانیوں میں پختگی اور گہرائی پیدا کر دی ہے۔ یہ کہانیاں اپنی فنّی ندرت، ذہانت اور سماجی شعور کی وجہ سے ذہن و دل کو بری طرح متاثر کرتی ہیں۔ ان کہانیوں میں ایک اچھی کہانی کی تمام خوبیاں موجود ہیں اور بقول ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی :

''ان کے کسی افسانے میں فن افسانہ نگاری کے اعتبار سے کوئی کسر نہیں ہے۔''

راجندر سنگھ بیدیؔ انسانی نفسیات پر مکمل دسترس رکھتے ہیں اور کرداروں کی روح میں اترنے کا فن جانتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے اپنی کہانیوں میں جو کردار پیش کئے ہیں وہ کہانی کی عام فضا سے پوری مناسبت رکھتے ہیں اور ہمارے ذہن پر دیرپا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کے نسوانی کردار خاص طور سے متاثر کرتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدیؔ عورتوں کی نفسیات سے بے حد واقف ہیں، یہ عورت، بیوی، بیٹی، ساس، بہو یا پھر طوائف اور بدکردار عورت کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ راجندر سنگھ بیدیؔ اس کے دل کے نہاں خانے میں اتر کر اس کے جذبات و

احساسات کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔ان کی کہانیوں کی عورت اپنی تمام پریشانیوں کے باوجود دوسروں کے درد کو محسوس کرتی ہے اور ان کا دکھ بانٹنے کی کوشش کرتی ہے۔ایک ماں کے روپ میں وہ بیٹی کی زندگی کا سارا زہر خود پی کر کہتی ہے۔

''بیٹی! تیرے سہاگ کے لئے رات ایک ماں نے اپنا سہاگ لٹا دیا۔''

''گرم کوٹ''۔''لاجونتی'' اور''اپنے دکھ مجھے دیدو'' جیسی کہانیاں اس لحاظ سے بہت نمایاں ہیں۔

اس طرح عورت کا تذکرہ راجندر سنگھ بیدیؔ کے یہاں جنسی جذبات کو ابھارنے یا لذت کوشی کے لئے نہیں ہوا ہے بلکہ جنس کے حقائق اور جسم کے اسرار کا بیان فنی تقاضے اور ایک سنجیدہ مقصد کے تحت ہوا ہے۔ٹیکنک اور پلاٹ کے اعتبار سے بھی راجندر سنگھ بیدیؔ کی کہانیاں ہر طرح سے مکمل ہیں۔

3.3.4 : عصمت چغتائی

عصمت چغتائی اُردو افسانے کی دنیا میں باغیانہ فطرت اور روایت شکن ذہن کے ساتھ داخل ہوئیں۔ روایت شکنی اور ان کے باغیانہ رجحانات کا سرچشمہ ان کی گھریلو فضا اور ان کی حد سے زیادہ حساس تخلیقی فطرت کو قرار دیا جاتا ہے۔لیکن مارکس وفرائڈ کے نظریات اور 'انگارے' کی افسانہ نگار ڈاکٹر رشید جہاں کے باغیانہ احساسات ورجحانات نے بھی انہیں کچھ کم متاثر نہیں کیا۔چنانچہ انھوں نے اپنے افسانوں میں جنسی موضوعات، بند کمروں کی باتوں اور شجر ممنوعہ قرار دی ہوئی حقیقتوں کو جگہ دے کی روایت سے انحراف اور اقدار شکنی کا ثبوت دیا۔

جنس نگاری کو عصمت چغتائی کی سب سے بڑی کمزوری اور سب سے بڑی طاقت دونوں ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ جہاں انھوں نے جنسی لطف اندوزی سے دامن بچاتے ہوئے حقیقت کے مخفی رازوں کو بے نقاب کرنے کی غرض سے جنسی موضوعات کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے وہاں وہ ایک کامیاب حقیقت نگار کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہیں اور 'ڈائن'۔'ساس'۔'نیرا'۔'جوانی'۔'گیندا'۔'اُف یہ بچّے'۔'دو ہاتھ' اور 'پیشہ' جیسی کہانیاں تخلیق کرنے میں کامیاب ہوسکی ہیں۔لیکن جہاں عصمت چغتائی کا مقصد جنس نگاری کی آڑ میں معاشرتی اقدار کو توڑنے اور گرم جملے لکھ کر مردوں کے جنسی میلانات کو متحرک کرنے کی حد تک محدود رہ گیا ہے وہاں ان کا فن حقیقت نگاری کے بجائے فحش لذت اندوزی سے ہمکنار نظر آتا ہے۔اس سلسلے میں ان کے بدنام زمانہ افسانہ

''لحاف'' کو پیش کیا جاسکتا ہے جس میں حقیقت نگاری اور مخصوص مسئلے کی عکاسی فحش لطف اندوزی اور شہوانی جذبات کی دھند میں مدھم پڑ گئی ہے۔ اس طرح اپنی تمام کہانیوں میں عصمت چغتائی نے کسی نہ کسی اہم معاشرتی مسئلے کو پیش کیا ہے۔ سماج کے ناسوروں اور روح کے زخموں پر نشتر چلایا ہے۔ روایت پسند معاشرے کا بخیہ اُدھیڑنے کی کوشش کی ہے۔ شروع میں لکھے گئے افسانے چونکا دینے والے اور نئی انوکھی اور جذباتی باتوں پر مشتمل ہوتے تھے، لیکن آگے چل کر تجربوں اور مشاہدوں نے انہیں حقیقت نگار بنا دیا۔

عصمت چغتائی کی کہانیاں اپنے مواد، تکنیک اور پلاٹ ہی کی وجہ سے چونکا دینے والی نہیں بلکہ اپنی زبان و بیان اور طنزیاتی لب ولہجہ کے اعتبار سے بھی قابل قدر اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی زبان متوسط طبقے کی معیاری زبان ہے۔ عورتوں کے مخصوص محاورات اور لب ولہجہ کا استعمال عصمتؔ کی کہانیوں سے بہتر کہیں اور نظر نہیں آتا۔ انہوں نے جدید افسانوی ادب کو کردار نگاری اور ڈرامائی کیفیت کے ساتھ ساتھ نفیس مکالموں اور جاندار رچی ہوئی زبان سے مالا مال کیا۔

اس طرح عصمت چغتائیؔ کی کہانیاں اپنے مواد، فن، تکنیک اور اندازِ بیان کے اعتبار سے اُردو افسانوی ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اگر وہ حد سے بڑھی ہوئی ترقی پسندی کے آسیب سے اپنے آپ کو بچا لیتیں اور اپنے فن کو فحش لطف اندوزی اور عریاں نگاری سے داغدار نہ بناتیں تو ان کے فن کی افادیت اور اہمیت کچھ اور ہی ہوتی۔

3.4 : خلاصہ

ترقی پسند تحریک کا با قاعدہ آغاز اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھنو میں منعقدہ اس کانفرنس سے ہوتا ہے جس کی صدارت شہرۂ آفاق ادیب منشی پریم چند نے کی تھی۔ اُردو کے معروف ادیبوں اور شاعروں نے اس تحریک کی سرپرستی کی جن میں مولوی عبدالحق، مولانا حسرت موہانی، جوشؔ ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، سیّد سجاد ظہیر، فیض احمد فیضؔ، ملک راج آنند، عزیز احمد وغیرہ شامل تھے۔

تحریک کے ابتدائی دور کی تخلیقات میں پریم چند، راجپوت سورماؤں کے قصے سنا کے ماضی کی بازیافت کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وطنیت، قوم پرستی اور پریم بھکتی کو راہِ نجات قرار دیتے ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانے 'سوز وطن' کے نام سے منظر عام پر آئے۔ لیکن آگے چل کر جب پریم چند کی ادبی زندگی کا دوسرا دور شروع

ہوتا ہے تو ان کے افسانوں میں تاریخی اور اصلاحی رنگ نمایاں ہوجاتا ہے۔ان اصلاحی افسانوں میں 'بازیافت'۔'حجِ اکبر'۔'سوتیلی ماں'۔'نجات'۔'مندر'اور'مستعار گھڑی' قابل ذکر ہیں۔اس کے بعد ان کی ادبی زندگی کا آخری دور شروع ہوتا ہے۔اس دور کے افسانوں میں پریم چند مصلح کا لبادہ اتار کر ایک انقلابی افسانہ نگار کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔وہ آدرش واد کے طلسمی دائرے سے نجات حاصل کر کے اس حقیقت کے معترف نظر آتے ہیں کہ بغیر انقلابی عمل کے حالات میں تبدیلی ممکن نہیں۔

علی عباس حسینی نے ترقی پسند تحریک سے پہلے''ایک ماں کے دو بچّے'''باسی پھول'اور''انسپکٹر کی عید' جیسے افسانے لکھے تھے۔ترقی پسندی سے متاثر ہوکر،''آم کا پھل''۔''کیا کیا جائے''اور'' بھوک'' جیسی کہانیاں لکھیں۔اس کے علاوہ ان کے افسانوں کے مجموعے آئی سی۔ایس۔باسی پھول اور میلہ گھومتی ہیں۔

ترقی پسند تحریک سے وابستہ راجندر سنگھ بیدؔی عورتوں کی نفسیات سے بے حد واقف ہیں،ان کی کہانیوں میں یہ عورت، بیوی، بیٹی ،ساس ، بہو یا پھر طوائف اور بد کردار عورت کے روپ میں سامنے آتی ہے۔راجندر سنگھ بیدؔی اس کے دل کے نہاں خانے میں اتر کر اس کے جذبات واحساسات کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔ان کی کہانیوں کی عورت اپنی تمام پریشانیوں کے باوجود دوسروں کے درد کو محسوس کرتی ہے اور ان کا دکھ بانٹنے کی کوشش کرتی ہے۔

جنس نگاری کو عصمت چغتائی کی سب سے بڑی کمزوری اور سب سے بڑی طاقت دونوں ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔جہاں انھوں نے جنسی لذتیت سے دامن بچاتے ہوئے حقیقت کے مخفی رازوں کو بے نقاب کرنے کی غرض سے جنسی موضوعات کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے وہاں وہ ایک کامیاب حقیقت نگار کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہیں اور ڈائن ،ساس ، نیرا ، جوانی، گیندا، اف یہ بچّے ، دو ہاتھ اور پیشہ جیسی کہانیاں تخلیق کرنے میں کامیاب ہوسکی ہیں عصمت چغتائی کی کہانیاں اپنے مواد، تکنیک اور پلاٹ ہی کی وجہ سے چونکا دینے والی نہیں بلکہ اپنی زبان و بیان اور طنزیاتی لب ولہجہ کے اعتبار سے بھی قابل قدر اہمیت کی حامل ہیں۔ان کی زبان متوسط طبقے کی معیاری زبان ہے۔عورتوں کے مخصوص محاورات اور لب ولہجہ کا استعمال عصمؔت کی کہانیوں سے بہتر کہیں اور نظر نہیں آتا۔انہوں نے جدید افسانوی ادب کو کردار نگاری اور ڈرامائی کیفیت کے ساتھ ساتھ نفیس مکالموں اور جاندار رچی ہوئی زبان سے مالا مال کیا۔

3.6 : فرہنگ

الفاظ	:	معنی
رعنائی	:	حسن، خوشنمائی
آسیب	:	صدمہ۔نقصان
متحرک	:	حرکت کرتا ہوا
انحراف	:	انکار کرنا
مضمر	:	چھپا ہوا
عمیق	:	گہرا
دسترس	:	مہارت، قدرت
توہم	:	شک۔گمان
تخیّل	:	خیال، تصوّر
مصلح	:	سماج میں سدھار لانے کی کوشش کرنے والا

3. 7 : خود جانچنے کے سوالات

سوال نمبر ا : (الف) : ایک جملے میں جواب دیجئے۔

(ا) 'لاجونتی' کس کی تصنیف ہے ؟

(۲) عصمت چغتائی کے افسانوں کا خاص موضوع کیا تھا؟

(۳) راجندر سنگھ بیدی نے کس کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر افسانے لکھے ہیں؟

(۴) افسانہ 'اپنے دکھ مجھے دے دو' کس نے لکھا؟

(ب) صحیح ہے غلط، نشاندہی کیجئے۔

(ا) گرم کوٹ، راجندر سنگھ بیدی کا لکھا ہوا افسانہ ہے۔ [ ]

(۲) پریم چند نے 'حج اکبر' لکھا۔ [ ]

(۳) عصمت چغتائی کے افسانوں کا موضوع متوسط طبقہ تھا۔ [ ]

(ج) مناسب اور صحیح جوڑیاں لگائیے۔

نمبر شمار	ستون الف	ستون ب
۱)	لاجونتی	منشی پریم چند
۲)	سوتیلی ماں	راجندر سنگھ بیدی
۳)	ڈائن	عصمت چغتائی
۴)	آم کا پھل	علی عباس حسینی

سوال نمبر۲ :

(الف) : مختصر جواب دیجئے۔

(۱) راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری کی خصوصیات کیا تھیں؟

(۲) عصمت چغتائی نے اپنے افسانوں میں کس بات کو موضوع بنایا؟

۳) علی عباس حسینی کی افسانہ نگاری کے بارے میں مختصر بیان کیجئے؟

(ب) : مفصل جواب تحریر کیجئے۔

۱) ترقی پسند تحریک کے اہم نثر نگار پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

۲) منشی پریم چند ترقی پسند تحریک کے ایک اہم نثر نگار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ بحث کیجیے۔

۳) راجندر سنگھ بیدی کی ادبی خدمات پر سیر حاصل تبصرہ کیجیے۔

۴) عصمت چغتائی کی نثر نگاری میں 'جنس' کا عنصر بہت زیادہ نظر پایا جاتا ہے۔ بحث کیجیے۔

3.8 : حوالہ جاتی کتب

اُردو ادب میں طنز و مزاح	از	وزیر آغا
اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	از	خلیل الرحمٰن
ترقی پسند ادبی تحریک	از	سردار جعفری
ترقی پسند ادبی تحریک کا پچاس سالہ سفر	از	ڈاکٹر قمر رئیس
ترقی پسند تحریک کی نصف صدی	از	سردار جعفری
جدیدیت کا فلسفیانہ اثر	از	ڈاکٹر شمیم حنفی
جدیدیت آج اور کل	از	شمس الرحمٰن فاروقی
جدیدیت ایک ہمہ جہت پہلو : محاسبہ	از	نریش ندیم

باب نمبر:4
جدیدیت کا رجحان اور اس کا آغاز وارتقاء

اکائی کے اجزاء

4.1 مقاصد
4.2 تمہید
4.3 جدیدیت کا مفہوم
4.4 جدیدیت کا آغاز وارتقاء
4.5 جدید اُردو شاعر اور نثر نگار
4.5.1 : ناصر کاظمی
4.5.2 : انتظار حسین
4.5.3 : قرۃ العین حیدر
4.5.4 : شمس الرحمٰن فاروقی
4.6 خلاصہ
4.7 فرہنگ
4.8 مشقی سوالات
4.9 حوالہ جاتی کتب

4.1 : مقاصد

☆ طلبہ جدیدیت کے مفہوم سے واقف ہوں گے۔

☆ طلبہ جدید اُردو شعراء سے واقف ہوں گے۔

☆ طلبہ جدید اُردو نثر نگار سے واقف ہوں گے۔۔

4.2 : تمہید

جدیدیت اپنے حالات کا تقاضا اپنے تجربوں اور نئے افقوں کی تلاش، مغرب کے نئے افکار سے متاثر اور جماعتی جبریاتی ترقی پسندیت کے ردعمل کے طور پر پیدا ہونے والا ایسا قومی رجحان ہے جو پہاڑی ندیوں کی طرح اپنے بہاؤ میں اپنے کناروں کو بہالے گیا جس کی وجہ سے زمین کی سیرابی اور اس کی زرخیزی میں اضافے کے فائدوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس اِکائی میں جدیدیت کے معنی ومفہوم، آغاز وارتقاء اور جدیدیت سے وابستہ اُردو شاعروں اور نثر نگاروں پر روشنی ڈالی جائے گی۔

4.3 : جدیدیت کا مفہوم

جدیدیت کیا ہے؟ تحریک، رجحان یا رویہ؟۔ اس سلسلے میں بہت اختلاف ہے۔ بعض ناقدین اسے تحریک کہتے ہیں اور بعض ناقدین اسے رجحان کہتے ہیں جب کہ بعض اسے صرف رویّہ مانتے ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف بحث ومباحثے بھی ہو چکے ہیں۔ پھر بھی کوئی نظریہ اس تک سامنے نہیں آیا۔ جس سے ادب میں بڑی غلط فہمیاں رواج پا رہی ہیں۔ اردو زبان وادب کے تنقید نگاروں کی آراء میں بہت اختلاف ہے۔ کچھ لوگ اِسے ترقی پسندی، وجودیت، رومانیت وغیرہ کی توسیع مانتے ہیں تو دوسرے اسے ترقی پسندی رومانیت کی نفی تسلیم کرتے ہیں۔ چند ماہرین کے خیالات مندرجہ ذیل ہیں :

بقول ڈاکٹر وزیر آغا :

''جدیدیت ایک خالص ادبی تحریک ہے ایک وسیع اور کشادہ تحریک، جس میں سماجی شعور کے علاوہ روانی وارتقاء، تہذیبی نکھار اور تخلیقی سطح میں شامل ہے۔''

بقول مجنوں گورکھپوری :

''جدیدیت کسی ایک میدان یا کسی ایک سمت کی نمائندگی نہیں کرتی، کبھی کوئی لاشعور کی حکمرانی کو جدیدیت قرار دیتا ہے تو کبھی وجودیت، شعور کی رَو، علامت نگاری اور تحدیدیت پسندی کو جدیدیت کہا جاتا ہے۔''

بقول ڈاکٹر محمد یٰسین صدیقی :

''جدیدیت کو تحریک یا رجحان کے بجائے اظہار خیال کا ایک مخصوص اور اچھوتا انداز کہنا درست ہے۔''

بقول آل احمد سرور:

''آج کا ادیب کسی نظریے کی غلامی کو قبول نہیں کرنا چاہتا وہ انسانی زندگی کو آزاد دیکھنے اور برتنے کا حق مانگتا ہے اور اس کا نام جدیدیت ہے۔''

بیسویں صدی کی پانچویں دہائی سے شروع ہونے والی تحریک کو جدیدیت سے تعبیر کیا جاتا ہے ظاہر ہے کہ جدیدیت سے پہلے والی تحریک کو ترقی پسند تحریک کہتے ہیں۔ پھر ترقی پسند تحریک سے پہلے کے تمام ادبی اثاثے کو قدیم کہیں گے یا روایت؟ کیا یہ تسلیم نہ کریں کہ میرؔ اپنے پیش روؤں کے مقابلے میں جدید تھے۔ غالبؔ اپنے پیش روؤں کے مقابلے میں کتنے جدید تھے۔ ان کا کلام بیشتر جدیدوں کے اوپر سے ہوکر آج بھی گزر جاتا ہے۔ کیا حالیؔ و اکبرؔ اپنے زمانے میں جدید نہ تھے؟ ظاہر ہے کہ یہ تمام ادبی موڑ اپنے پیش رو ادبی اثاثے کے مقابلے میں جدید تھے۔ چنانچہ ہر وہ تخلیق جو اپنے عصری تقاضے کا ساتھ دیتی ہے وہ جدید ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ زمانہ بدلے گا۔ زمانے کی قدریں بدلیں گی۔ مزاج و معیار بدلیں گے اور اس کے حسبِ حال جو تخلیق قدم سے قدم ملا کر چلے گی، وہ نئی ہی ہوگی، جدید ہی ہوگی۔

4.4 : جدیدیت کا آغاز و ارتقاء

'جدیدیت'۔ اصطلاحی شکل میں اُردو میں کافی بعد میں استعمال ہونا شروع ہوا جب کہ عالمی سطح پر اس کے زوال کا زمانہ، چوتھی اور پانچویں دہائی تھی۔ اُردو ادب میں اس کی شروعات لگ بھگ ۱۹۶۰ء کے آس پاس منظور کی جاتی ہے۔ ویسے عیسوی سن ۱۹۵۵ کو ہم ایک ایسا خطِ تنصیف مان سکتے ہیں۔ جب ایک طرف اُردو کی کامیاب ترین تحریک زوال پذیر ہونے لگی تھی اور جدیدیت کے تازہ اور نرم جھونکے نئی نسل کے ذہنوں کی آبیاری کرنے لگے تھے۔

اُردو ادب کی ہمہ جہت فروغ میں سب سے طاقتور کردار ادا کرنے والی تحریک، جسے ہم ترقی پسند تحریک کے نام سے جانتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء سے باقاعدہ شروع ہونے والی یہ تحریک اپنے عروج پر ہی تھی کہ تقسیم کا کرب

انگیز سانحہ رونما ہوا۔ موضوعات ہیں ہجرت، درد و کرب، پناہ گزیں کیمپوں کی رؤ داد اور دیگر لفظ شامل ہوتے گئے۔ حالات سنبھلے اور دوبارہ بسنے میں کئی برس لگے۔ اُردو ادب ترقی پسند تحریک کے خول پر تقسیم کے المیے بیان کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ اجتماعیت اپنا اثر کھونے لگی انسان خود کو تنہا محسوس کرنے لگا۔ ایسے میں ادیب و شاعر ترقی پسندی کے خول میں گھبراہٹ اور اکتاہٹ، اجنبیت وغیر مانوسیت، بے چینی و بے قراری، انقلاب آفرین نعروں کی گھٹن اور حبس بے جا کے شکنجے میں مقید فرد کی فردیت اور اس کی قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔

دوسری جانب ہر ایک ادنیٰ و معمولی سی تحریر کو ادب کا نام دیا جانے لگا۔ ان حالات میں نئی نسل کے ذہن میں روایت سے انحراف کے جراثیم کلبلانے لگے۔ اور پھر ایک ایسے ادبی رجحان کی تلاش شروع ہوئی جس میں فرد کی انفرادیت کو اوّلیت حاصل ہو جس میں خارجی عوامل کے اثرات سے انسان کے اندرون کا اظہار بھی ہو۔ جس میں نعرہ بازی کوئی فارمولا، کوئی منشور نہ ہو، تخلیق کار آزاد ہو، اس کا ذہن ہر 'دباؤ' سے پاک ہو۔ نئی نسل کی اس خواہش کے عین مطابق جدیدیت کا رجحان سامنے آیا۔ جدیدیت نے شروع میں خاموش رہ کر بعد میں پوری قوت کا استعمال کرتے ہوئے ترقی پسند تحریک کی مخالفت شروع کی۔ پروفیسر لطف الرحمٰن لکھتے ہیں :

''جدیدیت، لفظ جدید سے مشتق ایک ادبی اصطلاح ہے جس نے ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد اُردو میں ایک ہم گیر ادبی تحریک کی حیثیت حاصل کی۔ ترقی پسند تحریک کی سرمایہ دارانہ جبر و استحصال کے خلاف ایک اجتماعی بغاوت تھی جدیدیت، سماجی اور میکانکی جبریت کے خلاف ایک باغیانہ ردعمل ہے۔''

جدیدیت کے رجحان کو عام کرنے میں جہاں دوسرے اسباب کارفرما تھے وہیں اُردو کے کچھ رسائل بھی تھے جنھوں نے اس رجحان کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس ضمن سب سے نمایاں حیثیت شمس الرحمٰن فاروقی کی نگرانی میں شائع ہونے والے رسالے ''شب خون'' کی ہے۔ جس نے مسلسل جدیدیت کے رجحان کو عام کرنے کی کوشش کی اور اسے ایک مشن کے طور پر اپنایا۔ اس رسالے نے زیادہ تر ایسی ہی تخلیقات کو شائع کیا اور نئے افسانہ نگاروں، شاعروں کو ایسا ادب لکھنے کی تلقین کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جدیدیت کے رجحان کو عام کرنے میں ''شب خون'' نے ایک ادارے کا کردار ادا کیا اور اُردو تحریکات کی تاریخ میں نئی ایک نیا باب رقم کیا لیکن جدیدیت کے معنی اور اس کے پہلوؤں کو عام کرنے کا سہرا بھی ''شب خون'' کے ہی سر جاتا ہے۔ جدیدیت کے رجحان نے شدت اختیار کرنے میں بھی ''شب خون'' کی بیساکھیوں کا سہارا لیا۔

4.5.1 : ناصر کاظمی

آزادی کے فوراً بعد اُردو غزل میں جو شعراء نمایاں ہوئے ان میں ناصؔر کاظمی جدیدیت کی صنف کے تہذیبی مزاج سے شاید سب سے زیادہ شناسا تھے۔ غزل ان کے تجربے کا اظہار اور دل کی واردات تھی۔

اس غزل کا خمیر ناصؔر کاظمی کی یادوں کے جلے ہوئے بسیرے سے اٹھا تھا، اس لیے اس میں واقعاتی کرب بھی تھا اور آپ بیتی کی دل گرفتہ کیفیت بھی، سماجی بدنظمی اور نیرنگِ جہاں نے ناصؔر کاظمی کو میر تقی میؔر کی سی وارداتِ قلبی سے متعارف کرایا اور انھوں نے ایسی شعری کیفیت پیدا کی جس میں شاعر کسک تو محسوس کرتا ہے لیکن آنسو کو آنکھ سے ٹپکنے نہیں دیتا۔

ناصؔر کاظمی کی غزل کا یہ انداز استعاراتی تھا اور رنگِ میؔر نے اسے ایک نئی خستگی عطا کر دی تھی۔ چنانچہ ان کے اشعار سے روحِ عصر پوری طرح منعکس ہونے لگی کہتے ہیں:

تو کس خیال میں ہے منزلوں کے شیدائی
انھیں بی دیکھ جنھیں راستے میں نیند آئی

چمکتے بولتے شہروں کو کیا ہوا ناصؔر
کہ دن میں بھی مرے گھر میں وہی اداسی ہے

''برگِ نے''۔ ''دیوان'' اور ''پہلی بارش'' جیسے مجموعوں میں ناصؔر کاظمی کا فن مسلسل مائل بہ ارتقاء نظر آتا ہے۔ انھوں نے جس اداسی کو بال کھولے دیکھا تھا وہ ان پر مسلسل چھائی رہی۔ پیاسی تنہائی، جلتی اداسی، گونگی وادی اور بجھا سورج جیسی ترکیبیں ان کے داخلی کرب ہی کو ظاہر کرتی ہیں۔

میؔر کی طرح ناصؔر کاظمی نے بھی غزل کی نئی تہذیبی فضا پیدا کی لیکن وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکے اور نو عمری میں ہی حیاتِ وقت کی فصیل عبور کر گئے۔

4.5.2 : انتظار حسین

انتظار حسین کے فن کی ابتداء ''گلی کوچے'' کے افسانوں سے ہوئی تھی۔ 'کنکری'۔ 'آخری'۔ 'آدمی'۔ 'شہرِ افسوس' اور 'کچھوئے' سے ہوتے ہوئے جب وہ ''خیمے سے دور'' کے افسانوں تک پہنچے تو وہ ارتقائے

فن کے متعدد مراحل طے کر چکے تھے۔

ابتداء میں انھوں نے معاشرتی اور تہذیبی کہانیاں لکھیں، پھر اخلاقی انسان کی گم شدگی اور زوالِ آدمِ خاکی کو موضوع بنایا۔ آخری دور کے افسانوں میں انھوں نے اساطیر اور مذہبی کہانیوں کو علامتی انداز میں اس طرح لکھا کہ اس دور کی عصری آگہی ان کے داخل میں سما گئی۔

انتظار حسین علامتی اور استعاراتی اسلوب کو نت نئے ڈھنگ سے استعمال کرنے والے افسانہ نگار ہیں۔ ''کایا کلپ''۔ ''وہ جو دیوار چاٹ نہ سکے''۔ ''زرد کتّا''۔ ''کشتی''۔ ''آخری آدمی''۔ ''انتظار''۔ ''شجرۂ نسب''۔ ان کے چند معروف اور ممتاز افسانے ہیں۔ انتظار حسین کا فن عوامی نہیں۔ ان کے افسانے کا اسرار معلوم کرنے کے لیے وسیع المطالعہ ہونا بھی ضروری ہے۔

4.5.3 : قرۃ العین حیدر

اُردو افسانہ کو نئی جہت سے آشنا کرنے والوں میں قرۃ العین حیدر کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے اُردو فکشن میں قابل قدر اضافہ کیا۔ جہاں انھوں نے ''میرے بھی صنم خانے''۔ ''سفینۂ غمِ دل''۔ ''آگ کا دریا''۔ ''گردش رنگ چمن'' اور ''آخر شب کے ہم سفر'' جیسے شاہکار ناول لکھے۔ وہیں انھوں نے بے شمار ایسے افسانے بھی لکھے جو فکر و فن کے اعتبار سے اُردو ادب میں قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر رومانوی نقطہ نظر کی حامل ہیں۔ انھیں یہ رومانیت اپنے والد سجاد حیدر یلدرم سے ورثہ میں ملی ہے، مس حیدر کی یہ رومانیت انکے افسانوں میں بھی جھلکتی ہے۔ قرۃ العین حیدر اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہائی سوسائٹی کا فرد ہونے کی وجہ سے ان کے تعلقات بھی زیادہ تر اسی سوسائٹی کے لوگوں سے رہے۔ انھوں نے اس اعلیٰ طبقہ کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا۔ زمین داروں پہ آنے والے زوال اور جاگیردارانہ نظام کو دم توڑتے ہوئے دیکھا۔ انھوں نے اس صورت حال کو بڑی فنکارانہ چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ اپنی تخلیقات میں اعلیٰ طبقے کی کمزوریوں اور خباثتوں کو بے نقاب کیا ہے۔ اس سلسلے میں ''میں نے لاکھوں کے بول سہے'' اور ''ہاؤسنگ سوسائٹیاں'' جیسے افسانے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ ان افسانوں میں ہائی سوسائٹی کے خدوخال اپنے اصلی روپ میں نظر آتے ہیں کہ کس طرح اس سوسائٹی کے لوگوں کی نظر میں رشتوں سے کہیں زیادہ اہمیت مادی ترقی کو حاصل ہے

اور شادی کو بھی ترقی کا زینہ سمجھتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کا تعلق صنف نازک سے ہے اور وہ اس صنف کے درد اور اسکے مسائل کو اچھی طرح سمجھتی اور محسوس کرتی ہیں اور اس درد کو اپنے افسانوں میں سمونے کی کوشش کرتی ہیں۔ عورت کی ناقدری، مردوں کے ذریعہ اس کا استحصال اور اسکی مجبوری کا احساس قرۃ العین حیدر کے ذہن میں تلخی گھول دیتا ہے اور تلخی کا یہ احساس ان کے افسانوں کی فضا پر چھایا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ''کارمن''۔ ''حسب نسب'' اور "اگلے جنم موھے بٹیا نہ کیجیو" جیسے افسانے عورت کی مجبوری کی داستان سناتے ہیں۔ ان افسانوں کی ہیروئنیں مردوں کی بے وفائی اور ان کے ظلم وستم کی ماری ہوئی ہیں۔ ان کی قسمت میں مجبوری و بے چارگی، تشنگی اور اشک شوئی کے سوا کچھ اور نہیں اور یہ المیہ صرف ان افسانوں کی ہیروئنوں ہی کا المیہ نہیں بلکہ ایک پوری تہذیب کا المیہ ہے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے قرۃ العین حیدر کے افسانے رومانی طرز نگارش کے شاہکار ہیں۔ ترشے ترشائے جملے اپنے اندر بڑی لطافت اور نغمگی رکھتے ہیں۔ ان کے پاس لفظوں کا ایک بہترین خزانہ ہے جسے وہ اچھی طرح استعمال کرنے کا ہنر جانتی ہیں، ان کے افسانوں کے مکالمے مختصر مگر فکر اور جذبہ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یوں عام طور سے ان کی تحریریں شیرینی اور نغمگی میں ڈوبی ہوئی ہیں لیکن کہیں کہیں طنز کی نشتریت اور تلخی بھی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں کثرت سے انگریزی الفاظ کا استعمال نظر آتا ہے مگر بعد کے افسانوں میں ان کا استعمال بہت کم ہو گیا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی ان کے افسانے بہت کامیاب ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے افسانے فکری و فنی اعتبار سے کامیاب ترین افسانے ہیں۔ موجودہ زمانے میں ان کے افسانوں کی سی مقبولیت و شہرت بہت ہی کم افسانہ نگاروں کے افسانوں کو حاصل ہوئی ہے۔ ان کے بعض افسانے کرشن چندر، منٹو اور بیدی کے افسانوں کے مقابلے میں رکھے جا سکتے ہیں۔ بلاشبہ وہ اُردو زبان کی ایک بڑی افسانہ نگار ہیں۔

4.5.4 : شمس الرحمٰن فاروقی

شمس الرحمٰن فاروقی ایک عہد آفریں اور نظریہ ساز شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ شعر و ادب میں جدیدیت کے رجحانات کو فروغ دینے والے اور جدید تنقید کے روحِ رواں ہیں۔ مشرقی علوم پر کافی عبور رکھنے کے ساتھ

ساتھ مغربی نظریات پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ مگر وہ مغربی ادبیات سے استفادہ تو ضرور کرتے ہیں۔ اس سے مرعوب اور احساس کمتری میں مبتلا ہو کر اپنے ادبی ورثہ کو رد نہیں کرتے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے تنقیدی سرمائے پر نظر ڈالنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں ان کے تنقیدی سفر کے ابتدائی مراحل میں مغربی ادبیات کو زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے ۔ دوسرے مرحلے میں (یعنی ۱۹۷۵ء کے بعد) انھوں نے مشرقی شعریات بالخصوص کلاسیکی نظام بلاغت، عروض، آہنگ اور بیان کے مسائل اور ادب و تہذیب کے رشتوں کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ دی۔ غالبؔ اور میرؔ کی بازیافت کر کے انھوں نے عملی تنقید کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ اس سلسلے میں ان کی شاہکار تصنیف ''شعر شور انگیز'' کو اگر میرؔ کی نئی دریافت کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ قدیم تنقید میں یہ خیال ایک مسلمہ اصول کی حیثیت رکھتا ہے کہ سادگی، عام فہمی، روانی اور برجستگی محاسن شعر میں داخل ہیں، اسی طرح شعر کا نثر کی ترتیب کے مطابق ہونا کمال فن کی دلیل ہے۔ فاروقی اس مسلمہ نقطہ نظر کی تردید کرتے ہوئے اپنی کتاب ''شعر، غیر شعر اور نثر'' میں لکھتے ہیں:

''بے ساختگی اور بے تکلفی شاعری کی خوبیاں نہیں ہیں کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو جہاں وارد ہوتیں شعر کو بلند کر دیتیں (یعنی شاعری بنا دیتیں) اور ان کے برعکس اشیاء (مثلاً تعقید اور استعارہ) جہاں جہاں وارد ہوتیں شعر کو پست کر دیتیں۔ اگر بے ساختگی، بے تکلفی، سلاست، صفائی وغیرہ کا یہی عمل ہے۔ تو مندرجہ شعر کیا برے ہیں :

تجاہل ، تغافل ، تبسم ، تکلم یہاں تک وہ پہنچے ہیں مجبور ہو کر
لڑکپن میں الفت کا ہم کھیل کھیلے وہ تتلا کے کہنا الے لے ، الے لے

فاروقی کے تنقیدی موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ جس کا اندازہ مختلف موضوعات پر ان کی گرانمایہ تصانیف سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ''تفہیم غالبؔ''۔ ''شعر، غیر شعر اور نثر''۔ ''تنقیدی افکار''۔ ''عروض و آہنگ''۔ ''لفظ و معنی''۔ ''شعر شور انگیز''۔ ''انداز گفتگو کیا ہے؟''۔ ''افسانے کی حمایت میں'' اور ''اُردو غزل کے اہم موڑ'' ان کی اہم تصانیف ہیں جن میں انھوں نے اپنی منفرد رائے بڑے مدلل اور مستحکم انداز میں پیش کی ہے اور مختلف اصناف کی اس انداز میں تعبیر و تشریح کی ہے کہ بہت سے ایسے گوشے ہماری نگاہوں کے سامنے بے نقاب ہو گئے ہیں جو پردہ خفا میں تھے۔ اسی طرح انھوں نے تبصرہ نگاری کو عملی تنقید کی اعلیٰ صورت دی۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اچھی اور بری شاعری، قدیم و جدید شاعری، ادب اور زندگی کا رشتہ، ابلاغ و ترسیل، اور تنقید نگار کی ذمہ داریوں سے متعلق بڑی اہم باتیں لکھی ہیں اور ان موضوعات سے متعلق اٹھنے والے سوالات کا تسلی بخش جواب دیا ہے۔ انھوں نے ان مباحث سے متعلق اپنے خیالات بڑے معروضی انداز میں وضاحت و قطعیت کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ ان کے اس انداز تحریر، منطقی استدلال اور لہجہ کی قطعیت و وضاحت کو دیکھتے ہوئے انھیں موجودہ دور کا حالی قرار دیا گیا ہے۔

4.6 : خلاصہ

''جدیدیت'' اصطلاحی شکل میں اُردو میں کافی بعد میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ جب کہ عالمی سطح پر اس کے زوال کا زمانہ، چوتھی اور پانچویں دہائی تھی۔ اُردو ادب میں اس کی شروعات لگ بھگ ۱۹۶۰ء کے آس پاس منظور کی جاتی ہے۔ اُردو ادب کے ہمہ جہت فروغ میں سب سے طاقتور کردار ادا کرنے والی تحریک جسے ہم ترقی پسند تحریک کے نام سے جانتے ہیں۔

۱۹۳۶ء سے شروع ہونے والی یہ تحریک اپنے عروج پر ہی تھی کہ تقسیم کا کرب انگیز سانحہ رونما ہوا۔ دوسری طرف ہر معمولی وادنیٰ تحریر کو بھی ادب کا نام دیا جانے لگا۔ ان حالات میں نئی نسل کے ذہن میں روایت سے انحراف کے جراثم کلبلانے لگے ایک ایسے ادبی رجحان کی تلاش شروع ہوئی جس میں فرد کی انفرادیت کو اوّلیت حاصل ہو جس میں خارجی عوامل کے اثرات سے انسان کے اندرون کا اظہار بھی ہو۔ جس میں نعرہ بازی، کوئی فارمولا، کوئی منشور نہ ہو، تخلیق کار آزاد ہو، اس کا ذہن ہر 'دباؤ' سے پاک ہو۔ نئی نسل کی اس خواہش کے عین مطابق جدیدیت کا رجحان سامنے آیا۔

غزل ان کے تجربے کا اظہار اور دل کی واردات تھی۔ اس غزل کا خمیر ناصر کاظمی کی یادوں کے جلے ہوئے بسیرے سے اٹھا تھا، اس لیے اس میں واقعاتی کرب بھی تھا اور آپ بیتی کی دل گرفتہ کیفیت بھی، سماجی بدنظمی اور نیرنگِ جہاں نے ناصر کاظمی کو میر تقی میر کی سی واردات سے متعارف کرایا اور پھر انھوں نے ایسی شعری کیفیت پیدا کی جس میں شاعر کسک تو محسوس کرتا ہے لیکن آنسو کو آنکھ سے ٹپکنے نہیں دیتا۔ ''برگِ نے''۔ ''دیوان''۔ ''پہلی بارش'' جیسے مجموعوں میں ناصر کاظمی کا فن مسلسل مائل بہ ارتقاء نظر آتا ہے۔ انھوں نے جس اداسی کو بال کھولے دیکھا تھا وہ

ان پر مسلسل چھائی رہی۔ پیاسی تنہائی، جلتی اداسی، گونگی وادی اور بجھا سورج جیسی ترکیبیں ان کے داخلی کرب کو ہی ظاہر کرتی ہیں۔

انتظار حسین کے فن کی ابتداء ''گلی کوچے'' کے افسانوں سے ہوئی تھی۔ کنکری، آخری آدمی، شہرِ افسوس اور کچھوئے سے ہوتے ہوئے جب وہ ''خیمے سے دور'' کے افسانوں تک پہنچے تو وہ ارتقائے فن کے متعدد مراحل طے کر چکے تھے۔ ابتداء میں انھوں نے معاشرتی اور تہذیبی کہانیاں لکھیں، پھر اخلاقی انسان کی گم شدگی اور زوالِ آدمِ خاکی کو موضوع بنایا۔ انتظار حسین علامتی اور استعاراتی اسلوب کو نت نئے ڈھنگ سے استعمال کرنے والے افسانہ نگار ہیں۔ ''کایا کلپ''۔ ''وہ جو دیوار چاٹ نہ سکے''۔ ''زرد کتّا''۔ ''کشتی''۔ ''آخری آدمی''۔ ''انتظار''۔ ''شجرۂ نسب'' ان کے چند معروف اور ممتاز افسانے ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے ''میرے بھی صنم خانے''۔ ''سفینۂ غم دل''۔ ''آگ کا دریا''۔ ''گردش رنگ چمن'' اور ''آخر شب کے ہم سفر'' جیسے شاہکار ناول لکھے وہیں انھوں نے بے شمار ایسے افسانے لکھے جو فکر و فن کے اعتبار سے اُردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے قرۃ العین حیدر کے افسانے رومانی طرز نگارش کے شاہکار ہیں، ترشے ترشائے جملے اپنے اندر بڑی لطافت اور نغمگی رکھتے ہیں۔ ان کے پاس لفظوں کا ایک بہترین خزانہ ہے جسے وہ اچھی طرح استعمال کرنے کا ہنر جانتی ہیں، ان کے افسانوں کے مکالمے مختصر مگر فکر اور جذبہ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اچھی اور بری شاعری، قدیم و جدید شاعری، ادب اور زندگی کا رشتہ، ابلاغ و ترسیل، اور تنقید نگار کی ذمہ داریوں سے متعلق بڑی اہم باتیں لکھی ہیں اور ان موضوعات سے متعلق اٹھنے والے سوالات کا تسلی بخش جواب دیا ہے۔ انھوں نے ان مباحث سے متعلق اپنے خیالات بڑے معروضی انداز میں وضاحت و قطعیت کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ فاروقی کے تنقیدی موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ جس کا اندازہ مختلف موضوعات پر ان کی گرانمایہ تصانیف سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ 'تفہیم غالبؔ' 'شعر، غیر شعر اور نثر' 'تنقیدی افکار' 'عروض و آہنگ' 'لفظ و معنی' 'شعر شور انگیز' 'انداز گفتگو کیا ہے؟' افسانے کی حمایت میں' اور 'اُردو غزل کے اہم موڑ' ان کی اہم تصانیف ہیں جن میں انھوں نے اپنی منفرد رائے بڑے مدلل اور مستحکم انداز میں پیش کی ہے۔

4.7 : فرہنگ

الفاظ	:	معنی
نفی	:	کسی چیز کے وجود سے انکار، (اثبات کی ضد)
تحدیدیت	:	پابندی، حد باندھنا
اضطراب	:	بے چینی
آبیاری	:	باغوں اور کھیتوں کو سینچنا۔ پانی دینا۔
مقید	:	قید کیا گیا۔ قیدی۔ اسیر
مزیّن	:	سجایا ہوا۔ آراستہ۔

4.8 : خود جانچنے کے سوالات

سوال نمبر ا : (الف) : ایک جملے میں جواب دیجئے۔

(۱) شعر شور انگیز کس کی تصنیف ہے؟

(۲) غالب اور میر کی شاعرانہ عظمت کی بازیافت کس نے کی؟

(۳) اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجیو' کس کا لکھا ہوا افسانہ ہے؟

(۴) قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا موضوع کس طبقے سے متعلق ہے؟

(۵) رسالہ 'شب خون' کس مشہور نقاد کی زیر نگرانی جاری ہے؟

(ب) صحیح ہے غلط، نشاندہی کیجئے۔

(۱) جدیدیت کی بنیاد شمس الرحمٰن فاروقی نے رکھی۔ [ ]

(۲) قرۃ العین حیدر متوسط طبقے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ [ ]

(۳) انتظار حسین نے ترقی پسند تحریک کو اپنا لیا تھا۔ [ ]

(۴) شعر، غیر شعر اور نثر مولانا حالی کی تصنیف ہے۔ [ ]

(ج) مناسب اور صحیح جوڑیاں لگائیے۔

نمبر شمار	ستون الف	ستون ب
۱)	شعر شور انگیز	قرۃ العین حیدر
۲)	انتظار	شمس الرحمٰن فاروقی
۳)	اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجیو	رسالہ
۴)	شب خون	انتظار حسین

سوال نمبر۲ :

(الف) : مختصر جواب دیجئے۔

(۱) جدیدیت سے کیا مراد ہے ؟

(۲) جدیدیت کا آغاز کب ہوا اور کیوں کر۔ لکھئے؟

۳) شمس الرحمٰن فاروقی کا نام جدیدیت سے کس بناء پر وابستہ ہے؟

(ب) : مفصل جواب تحریر کیجئے۔

(۱) جدیدیت کا مفہوم مفصل بیان کیجیے۔

(۲) جدیدیت کا آغاز وارتقاء پر روشنی ڈالیے۔

(۳) جدیدیت کے اُردو شعراء کی معلومات لکھیے۔

(۴) جدیدیت کے اُردو نثر نگاروں کی ادبی خدمات کا ذکر کیجیے۔

(۵) ناصر کاظمی کی جدید شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیجیے۔

(۶) قرۃ العین حیدر کی نثر نگاری پر نوٹ لکھیے۔

(۷) شمس الرحمٰن فاروقی ایک عظیم تنقید نگار تھے۔ بحث کیجیے۔

4.9 : حوالہ جاتی کتب :

جدیدیت اور اُردو افسانہ از ڈاکٹر اسلم جمشید پوری
جدیدیت کے فلسفیانہ اساس از شمیم صنفی
اُردو ادب میں طنز و مزاح از وزیر آغا
اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک از خلیل الرحمٰن
ترقی پسند ادبی تحریک از سردار جعفری
ترقی پسند ادبی تحریک کا پچاس سالہ سفر از ڈاکٹر قمر رئیس
ترقی پسند تحریک کی نصف صدی از سردار جعفری
جدیدیت کا فلسفیانہ اثر از ڈاکٹر شمیم حنفی
جدیدیت آج اور کل از شمس الرحمٰن فاروقی
جدیدیت ایک ہمہ جہت پہلو : محاسبہ از نریش ندیم
اردو ادب کا ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصّہ از منظر اعظمی